Compliments from the writer to Mr. Badiruddin
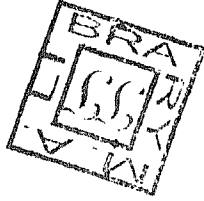
Akhtar
July 9, 3[illegible]
Bahadur Manzil
Saifabad
Hyderabad
(Deccan)

ادب اور زندگی

از

جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی-اے

مطبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

سنہ ۱۹۳۵ع

ادب اور زندگی

از

(از جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی - اے)

ماضی کو سمجھہ ' مستقبل کا پیغام دنیا کو سنا — میرے ضمیر سے
ادب کا یہ تقاضا تھا - ماضی اور استقبال کو میں سمجھا لیکن
' آج کی ' دنیا میں میرے لئے جگہ نہیں - اب ادب کا یہ تقاضا
ہے کہ میں اپنی زندگی ختم کردوں " —

(روسی ادب جدید کے علم بردار ' میکوسکی ' کا آخری خط)

ادب کیا ہے ؟ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی ؟ ادب کے مقاصد کیا ہیں ؟ — یہ سوالات اتنے ہی پرانے ہیں جتنی علم ادب کی زندگی - ارباب حل و عقد نے اس مبحث پر بڑے بڑے دفتر سیاہ کردئے اور اب اس موضوع پر از سرنو کچھہ کہنا تحصیل حاصل سمجھا جاے گا - اگر مجھے اس کا احساس نہ ہوتا کہ آج زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے سماج ایک دور تغیر سے گزر رہا ہے اور انسانیت ارتقاء بالضد (Dialectics) کے دوراہے پر آکر ہر ایماندار ادیب سے پوچھہ رہی ہے کہ —

" دونوں میں سے کس کے مؤید ہو — پیشہ ور گوشہ نشینی
یا عوام سے یگانگی ؟ جنگلوں اور پہاڑوں کی چاہت یا انسان
کی خدمت ؟ غیر ذمہ وارانہ خودسری یا خیالات کا ارتباط

قدرت یا ضمیر ؟ جبر یا اختیار ؟ تقدیر یا تدبیر ؟ قدرت کی
اطاعت یا قدرت پر حکومت ؟ آرٹ آرٹ کے لئے یا آرٹ انسان
کے لئے ؟ زمین یا آسمان ؟ دوئی یا یگانگی ؟ — ان میں
سے ایک پر زندہ درگور دنیائے قدیم کا انحصار ہے اور دوسرے پر
مستقبل کا دار و مدار — تم دونوں میں سے کس کے حامی ہو ؟ "
(زمانۂ حال کا ادب از پی - سی - کوگن)

اگر یہ مرحلہ در پیش نہ ہوتا اور ادیب سماج کا ایک فرد نہیں بلکہ کوئی بن باسی ہوتا تو مضمون کی نوعیت مجھے قلم اُٹھانے کی اجازت نہ دیتی - مگر چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور حقائق زندگی و اشارات ادب کی خلیج اس ملک میں وسیع تر ہوتی جاتی ہے اچھا ہو کہ یہ مسئلہ پھر چھیڑا جائے اور یاران نکتہ داں کے آگے یہ اہم سوال پیش کیا جائے —

مضمون کے پہلے حصے میں دکھایا جائے گا کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے - پھر جب یہ تصفیہ ہوچکے گا کہ زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں تو روح مقصد کی وضاحت کے لئے ہم ہندوستانی ادب کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہمارے ادب نے اپنے فرائض کی تکمیل کس حد تک کی ہے - میرا خیال ہے کہ ہندوستان پر برطانیہ کی فتح سامنتی (Feudal) تمدن پر حرفتی (Industrial) تمدن کی فتح تھی اور دیسی سماج کی سامنتی بنیاد جو پلاسی کی جنگ سے پہلے متزلزل ہو رہی تھی ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع کے صدمے سے اس کا شیرازہ تیزی سے منتشر ہونے لگا - ہنگامۂ سنہ ۵۷ ع ہمارے سماج کی منزل ارتقا میں ایک حد فاصل قائم کرتا ہے - اس زاویۂ نگاہ کی روشنی میں ادب ہند کے بھی دو دور مقرر کئے جا سکتے ہیں - ایک وہ

جو اس زمانہ کے لگ بھگ انحطاط پذیر ہونے لگتا اور دوسرا وہ جو اس کے بعد رفتہ رفتہ آنکھیں کھولنے لگتا ہے - آسانی کے لئے ہم انہیں قدیم اور جدید ادب کہینگے - یہ تجزیہ خالصاً معاشی ہے - برسبیل تذکرہ مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں کہ غزل گوئی کا زوال سامنتی تہذیب کی تباہی کا پرتو اور نظم کی اٹھان سماج کے بند پانی کی روانی کی علامت ہے جو ہنوز رسوم و اوہام کی کشمکش میں مبتلا ہے —

کسی یونانی حکیم کا قول ہے کہ خیالات کی اینٹوں کو جذبات کے چونے سے ہی جوڑا جاسکتا ہے - انسان خیالات و جذبات کا مجموعہ ہے - سائنس خیالات میں ربط و نظم قائم کرتا اور ان کی تراش خراش کرتا ہے - آرٹ جذبات کو بناتا ، سنوارتا اور نقش و نگار اشارات و الفاظ کے ذریعے ان کی ترجمانی کرتا ہے - ادیب اپنی جذباتی کیفیات کو الفاظ کا جامہ پہناتا اور اپنی افتاد طبیعت کے مطابق اس کی کاٹ چھانٹ کرتا ہے - مدعا یہ ہے کہ ادب جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے - دیکھنا یہ ہے کہ جذبات کی ترتیب و تکوین کس طرح ہوتی ہے - ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطیع ہے اور حالات کے مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں - فضا کا ہیر پھیر کبھی آدمی کو رلاتا اور کبھی ہنساتا ، کبھی آزردہ اور کبھی غضبناک بنا دیتا ہے - مثلاً ' موت ' اور ' بھوک ' کے مسائل ہمیشہ آدمی کو خون کے آنسو رلاتے رہے ہیں - ایک کے لئے قدرت دوسرے کے لئے سماج ذمہ وار ہے - اگر یہ دو مصیبتیں نہ ہوں تو ہمارے ادیب کی حزنیت بہت کم ہوجائے گی اور پھر فراق یار کے علاوہ بہت کم چیزیں اسے رنج دیا کریں گی- اگر سماج اور قدرت کے نظام میں ایسی تبدیلی ہو کہ یہ فضا بدل جائے تو ایسے جذبات بھی پیدا نہ ہوں گے —

اب تک ہمارے تنقید نگاروں نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ھے کہ ادیب نے جذبات کو کس طرح ظاھر کیا ھے - (Form) کی اھمیت سے کسے انکار ھو سکتا ھے - لیکن اگر یہ سمجھ لیا جاے کہ ادیب جن جذبات کو آشکار کر رھا ھے وہ الہامی نہیں بلکہ ماحولی ھیں تو یہ سوال زیادہ اھم ھو جاتا ھے کہ ان جذبات کو کون اور کیوں ظاھر کر رھا ھے - ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش سے ھر انسان کی طرح متاثر ھوتا ھے- وہ جس زمانے میں جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پاے گا' جن لوگوں کے ساتھ رھے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ھوگا — وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ روپ دیں گے' اس لیے میری ناچیز راے میں کسی ادیب کی روح کو سمجھنے کے لئے اس فضا کو سمجھنا زیادہ ضروری ھے جس میں اُس نے پرورش پائی - جب تک اس زمانے کی زندگی نہ سمجھی جاے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ ادیب نے یہی کیوں کیا' اس کے خلاف کیوں نہیں کیا - اس لئے کہ ادیب اپنے جذبات کی نہیں اپنی فضا کے جذبات کی ترجمانی کر رھا ھے - اس کی زبان سے اجتماعی انسان بول رھا ھے —

فرض کیجئے کہ کسی شہر میں ایک کارخانہ بنایا جاتا ھے - اس کی تعمیر کی ظاھری صورت یہی ھے کہ ایک امیر نے سرمایہ لگایا انجنیر نے نقشہ بنایا اور مزدوروں کی محنت نے سرمایہ کھڑا کردیا - لیکن واقعہ تو یہ ھے کہ جب تک اقتصادی ضروریات کا مطالبہ نہ ھوتا کہ کارخانہ بنایا جاے اس وقت تک اس کا خیال بھی کسی کے ذھن میں نہ آتا - کارخانے کی وجہ تعمیر کو سمجھنے کے لئے اس زمانہ کی مالیات پر غور کرنا چاھئے نہ کہ اس سیٹھ کی تھیلی کی لمبائی اور انجنیر کے نقشہ کی

ستھرائی پر - اسی طرح کسی زمانے کے ادب کا غائر مطالعہ مقتضی ہے
اُس زمانے کے حالات کو سمجھنے کا کہ اُن مخصوص جذبات کو اُن مخصوص
حالات نے ہی پیدا کیا تھا - سنسکرت شاعری جن جذبات کی حامل ہے
وہ قدیم ہند کے اساطیر (Myths) کے پس منظر میں ہی سمجھہ میں آ سکتے
ہیں - سماج اپنے عہد طفلی میں اپسراؤں* اور راکشسوں کے افسانے سن
اور سمجھہ سکتا ہے لیکن اب اپنے زمانۂ پیری میں وہ ان رنگین خوابوں کا
تانا بانا کیوں کر بُن سکتا ہے جب کہ اپسرا کی جگہ سینما کی طوائف اور
راکشس کا نمبر روبت† (Robot) نے چھین لیا ہے اب شمع پر پروانے بھی
کم آتے ہیں کہ آگ کی جگہ بجلی آ گئی اور خرمن پر برق بھی کم گرتی
ہے کہ اس پر برقی سلاخ نصب کر دی گئی ہے! صحراؤں میں محمل کا
پتا نہیں کہ موٹر چلنے لگے اور ڈولیوں کا رواج بھی کم ہو چلا کہ کہاروں
کے کاندھے چھل گئے - زمانے کے رد و بدل نے سنسکرت شاعری کے پر نوچ لیے
اور احساسات و جذبات کی تبدیلی کا یہ مطالبہ ہوا کہ ہندوستانی
ادب کا دھارا اپنے بہاؤ کے لیے نیا میدان تلاش کرے —

اب یہ دیکھنا ہے کہ ادب کے فرائض کیا ہیں - میرا مطلب
اُن کے مقصد سے نہیں ہے - طالسطائی کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ آرٹ
جذبات انسان کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے مغنی ایک یاس انگیز نغمہ
چھیڑتا ہے اور سننے والے بلا امتیاز اندوہ و الم سے چیخ اُٹھتے ہیں -
شاعر طرب و نشاط کا گیت سناتا ہے تو سننے والے شادماں ہو جاتے ہیں -
دستوویسکی جب "گناہ اور سزا" میں ایک روح کی کشمکش دکھاتا ہے تو
ناظر کی روح میں گتھی سی پڑ جاتی ہے - ادیب کے کمال کا ایک معیار

* اپسرا - حور کا ہندو تصور -　　　　† روبت - مصنوعی انسان -

یہی ہوسکتا ہے کہ اپنے جذبات سے وہ دوسروں کو کس حد تک متاثر کرسکا۔ اُس کی عبارت زمان و مکان کے امتیاز سے جتنی بالا تر ہوگی ' اس کا آرٹ اتنا ہی دیرپا اور مستحسن سمجھا جاے گا مگر وہ اپنے ماحول سے جدا نہیں ہوسکتا اپنے ماحول کے تاثرات کو بیان کرتا ہے یعنی اپنے ماحول سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے - جب تلسی داس ایک زن مرید باپ کی اطاعت کو بیٹے کا دین و مذہب بتلاتا ہے تو اُس کے قلم سے اُس زمانے کی تہذیب بولتی ہے جس میں بیٹے کی حیثیت باپ کی غیر منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی - آج جب ہر بیٹا اپنی انفرادیت کو شفقت پدری سے زیادہ قیمتی سمجھہ رہا ہے تو اس قسم کی تعلیم رجعت اور قدامت سے تعبیر کی جاےگی-

یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آرٹ کا مقصد کیا ہے :

' ادب براے ادب ' کے علم برداروں کا خیال ہے کہ روح اور خدا کی طرح ادب بھی کوئی مافوق اللامین (Super Organic) شئے ہے اور جس طرح حسن و حقیقت کو عام معیار پر نہیں جانچا جاسکتا اسی طرح ادب سے سرور و حظ اسی حالت میں حاصل کیا جاسکتا ہے کہ اسے سماج کی پابندیوں سے الگ رکھا جاے - جمالیاتی نقطۂ نظر ' جس کے موئید ہیگل ' شوپین ہوؤر فلشے اور بہت سے انگریز ادبا اور مفکرین ہیں ' آرٹ کا مقصد تلاش حسن کو قرار دیتے ہیں - اخلاقی نقطۂ خیال جس کی تشریح طالسطائی نے کی ' آرٹ کو نیکی کا آئینہ دار قرار دیتا ہے - معاشی اور مادی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں معیار مبہم اور ادھورے ہیں - اگر یہ صحیح ہے کہ ادیب انسان ہے اور ہر انسان کی طرح ماحول متاثر ہوتا ہے اور اگر یہ حقیقت ہے کہ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے اور انسانیت اُس سے اثر اندوز ہوتی ہے - تو ادب اور انسانیت کے مقاصد ایک ہیں -

ادب زندگی کا ایک شعبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ مادی سرزمین میں جذبات انسانی کی تشریح و تفسیر کرتے ہوے وہ روح القدس بننے اور عرش پر جا بیٹھنے کا دعویٰ کرے- زندگی کا ڈھانچا مکمل اور واحد ہے - اس میں سائنس آرٹ اور فلسفہ کے مختلف خانے نہیں ہیں کہ جس کا جی چاہے کہہ دے کہ مجھے زندگی سے کیا غرض، میں آپ اپنے لئے زندہ ہوں! اور چیزوں کی طرح فن و ادب بھی زندگی کے پروردہ اور خادم ہیں- ادب ماضی و حال اور حال و مستقبل میں رشتہ جوڑتا ہے - رنگ و نسل اور ملک و قوم کی بندشوں کو توڑ کر وہ بنی نوع انسان کو وحدت کا پیغام سناتا ہے - کوئی وجہ نہیں کہ اتنے اہم معاشی فریضے کو ایک فن کار اپنی ذاتی ملکیت سمجھے اور اس کا یہ دعویٰ تسلیم کرلیا جاے - حسن کیا ہے جس کی تلاش میں مدعیان ادب برائے ادب مدتوں سے سرگرداں ہیں ؟ حسن کی تعریف نا ممکن سی ہے - والٹیر نے اپنی مشہور تصنیف (Dictionaire de Philosophie) میں ان لوگوں کا بڑا مذاق اُڑایا ہے جو حسن کا کوئی معیار قایم کرنا چاہتے ہیں - وہ لکھتا ہے کہ مینڈکی کو بھی اپنی نرم اور چمکدار جلد پر خوبصورتی کا دعویٰ ہے اور ایک حبشی حسینہ کے چہرے اور موٹے ہونٹوں پر بھی عاشقوں کا گروہ دل و جان قربان کرتا ہے - جرمنی کے کلاسکل فلاسفروں کے نزدیک یہ وہ چیز نہیں ہے جو آدمی کو خوش کرتی ہے - اس کے یہ معنی ہوے کہ ادب کا مقصد اُولیٰ تفریح طبع ہے اور چونکہ دعویٰ یہ بھی ہے کہ آرٹ زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے لہذا تفریح زندگی کی معراج ہوئی ! پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک آدمی جس چیز سے مسرور ہوتا ہے وہ دوسرے کے لیے اجیرن ہے - زندگی اور ادب کا یہ نظریہ اس قدر بے معنی ہے کہ اس پر کچھہ لکھنا فضول ہے - پھر کیا آرٹ کا مقصد تلاش حق ہے ؟ حقیقت

کیا ہے! کیا حقیقت کی کوئی قطعی اور آخری تعریف ہوسکتی ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو؟ جو چیز ایک کے لیے اچھی ہے دوسرے کے لیے بری - امیر کے لیے جو حق ہے وہ غریب کے لیے ناحق ہے - پھر ادب کس حقیقت کا جویا ہے -

میں پھر اپنے اسی جملے کو دھراتا ہوں کہ زندگی کے مقاصد سے ہٹ کر ادب نہ اپنی منزل تلاش کرسکتا ہے اور نہ یہ ممکن ہے - زندگی کی روانی اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے، عام اس سے کہ وہ اپنے آپ کو رموز حیات کا محرم اور حسن و عشق کا پروردگار کہتا رہے - ایک انسان اور ایک ادیب کے فرایض و مقاصد یکساں اور مشترک ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ ایک اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا اور دوسرا اس سے متاثر ہوتا ہے - یہ صحیح ہے کہ دنیائے ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں ملیں گی کہ ادیب اپنے ماحول سے بے خبر اور آزاد ہوکر آگے یا پیچھے جانا چاہتا ہے - اپنے موقع پر ایسی واردات کے اسباب پر بھی غور کیا جائے گا اور ہم دیکھیں گے کہ یہ حالات کا ہی رد عمل تھا، کوئی الہامی کیفیت نہ تھی —

اب تک ہم جن نتائج پر پہنچے وہ یہ ہیں —

(۱) ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے —

(۲) زندگی اور ادب کے مقاصد ایک ہیں —

زندگی کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر ہمیں سماج کی بنیاد کا جائیزہ لینا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ سماج کیوں بنتا اور بگڑتا ہے اور یہ تبدیلیاں اسے کس منزل کی طرف لے جا رہی ہیں -

سماج ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو اشتراک عمل کے لیے یکجا ہوتے ہیں - اشتراک اور تعاون کے لیے ان افراد کا مقصد یکساں ہونا ناگزیر ہے - ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک سی ہوتی ہیں اور سماج کی

ابتدا اس غرض سے ہوتی ہے کہ ضروریات زندگی کے حصول و تقسیم میں آسانی ہے - یعنی سماج کا سنگ بنیاد انسان کی مالی ضروریات کی پیداوار اور تقسیم پر ہے اور افراد کا رشتۂ باہمی اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے - سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ اس کے افراد کا رشتہ مستحکم ہوتا جاتا ہے یعنی ضروریات زندگی کی بہم رسانی آسان ہوتی جاتی ہے جس سے انہیں اپنی خواہشوں کی تکمیل کا موقع ملتا ہے - پیداوار کے ذرائع جتنے وسیع اور کارآمد ہوں گے اور مال کا طریقۂ تقسیم اکثریت کے لیے جتنا قابل قبول ہوگا اسی اعتبار سے نظام معاشی کی عمر دراز ہوگی - سماج کے ارتقا سے مراد دراصل پیداوار کے انہیں ذرائع کے ارتقا سے ہے - دور وحشت سے گزر کر انسان دور حرفت میں کیسے پہنچ گیا ، اسے سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کلہاڑی نے ٹریکٹر کی شکل کس طرح اختیار کرلی اور نیزہ مشین گن کیسے بن گیا - پیداوار کے ذرائع دو حصوں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں - ایک طرف تو قدرتی ذرائع و عناصر ہیں جنہیں حسب ضرورت کارآمد بنانا ہے اور دوسری طرف وہ انسانی محنت ہے جو یہ فرض انجام دیتی ہے - زمین کان اور خام اشیا کی دوسری قدرتی رسد گاہیں جیسی پہلے تھیں ویسی ہی اب بھی ہیں - ان میں فرق نہیں آتا - سماج کا ارتقا و تغیر محتاج ہے انسانی محنت کا' جو ان اشیا کو قابل استعمال بناتی ہے - جس کھیت میں کاشتکاری کے فرسودہ طریقوں سے دس من غلہ پیدا ہوتا تھا آج وہاں مشینوں سے سیکڑوں من اناج پیدا ہوتا ہے - یہ پیداوار کے ذرائع کی ترقی ہے جسے ہم سماج کی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں - پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ نظام معاشی کا بنیادی پتھر ' ضروریات زندگی کی پیداوار پر رکھا گیا ہے اور سماج اسی

وقت تک قایم ھے جب تک اس کے افراد کا رشتۂ باھمی مستحکم ھے جس کی ضمانت ھر فرد کی ضروریات کی تکمیل ھے - اس سے یہ لازم آیا کہ پیدا وار اور تقسیم کے طریقے ایسے ھونے چاھئیں کہ ھر فرد اپنی بساط کے مطابق محنت کرکے اپنی ضروریات حاصل کر سکے - یعنی پیدا وار اور تقسیم کا ارتباط رشتۂ افراد کے استحکام کا ضامن ھو سکے - ھر فلسفۂ زندگی کا منشا یہی ھے کہ ھر فرد بشر کو روحانی، ذھنی و جسمانی نشو و نما کا موقع مل سکے - مگر انسان کا مادّی وجود اس کا مقتضی ھے کہ سب سے پہلے اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام ھو - سرمایہ دولت یا امارت سے وھی لوگ بہرہ مند ھوتے ھیں جو پیدا وار کے ذرائع پر کسی نہ کسی طرح قابض ھوتے ھیں - غریب و فقیر وہ لوگ ھیں جو ان کی ملکیت سے محروم ھیں - اگر کبھی ایسا ھو سکے کہ پیدا وار کے ذرائع پر کوئی ایک طبقہ نہیں بلکہ پورا سماج قابض ھو اور مال کی تقسیم اس طرح ھو کہ ھر محنت کش فکر روزگار سے آزاد ھو جاے اور آئندہ نسل کی تربیت و پرورش کی کفالت و تحفظ سماج کر سکے، تو یہ سماج کی مادی ترقی کی انتہا ھے اور اس کے ساتھہ ساتھہ وہ ذھنی و تمدنی اعتبار سے بھی انسانیت کو مرتبۂ بلند کی طرف لے جاسکے گا، اور اس وقت روح الاجتماع خدا وند بن جاے گی اور کثرت و وحدت میں کوئی تنازع نہ رھے گا۔ یہ زندگی کا مقصد اولیٰ ھے اور اس کا تقاضا ھے کہ اس کا ھر شعبہ اس کے حصول کے لئے کوشاں ھو —

اسی چیز کو مدنظر رکھہ کر ادب جدید کا پیغمبر 'میکسم گورکی' کہتا ھے : ادب انسانیت کا نقاد ھے - وہ اس کی کجروی کو ظاھر کرتا اور اس کی خامکاریوں کو بے نقاب کرتا ھے - اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ھے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بناے - ادب کی یکتائی

اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں ہے بلکہ حالات اس کے غلام ہیں - وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے - اس لحاظ سے ادب تغیر پسند قدامت شکن اور دور جدید کا پیش رو ہے - "

ادب زندگی کے اس سوال کا جواب ہے کہ انسان کس سے محبت اور کس سے نفرت کرے اور کس طرح زندہ رہے - یہ سچ ہے کہ تدریسیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں - روگی انسانیت کو وہ پند و نصیحت کی کڑوی دوا نہیں پلاتا بلکہ ہلکے اور میٹھے سروں سے اس کی عیادت کرتا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ ادب کے ماخذ ماضی و حال نہیں لیکن وہ مستقبل کا جویا ہے - وہ پیچھے یا دائیں بائیں طرف اس غرض سے دیکھ لیتا ہے کہ منزل حیات کے نشیب و فراز کو دیکھ سکے اور آگے بڑھ سکے - تاریخ کے مخزن میں اس کی جگہ صف آخر میں نہیں بلکہ پیش پیش ہے - لہذا ادب کا یہ مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہوتے ہوئے بھی اپنے گرد و پیش کا آئینہ دار ہو تاکہ اس کے حسن و قبح سے آگاہ ہوکر انسانیت ترقی کے زینوں پر گامزن ہو - علم اور ادب میں وہی فرق ہے جو استاد کی دھمکیوں اور ماں کی لوریوں میں - ادب وہ استاد ہے جو کہانیوں اور گیتوں میں انسانیت کو رموز حیات سمجھاتا ہے - ادب کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں ان جذبات پر نفرین کرے جو دنیا کو آگے نہیں بڑھنے دیتے اور پھر وہ انداز بیان اختیار کرے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسکے - کیونکہ بہر حال زندگی کا مقصد یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ بھلا ہوسکے —

ادب ہند کا ایک خاکہ پیش کرکے ہم یہ دیکھینگے کہ وہ کہاں تک مذکورہ مقصد کا حامل رہا ہے کیا وہ زندگی کے حقائق اور مقاصد کی ترجمانی کرتا رہا ہے اور کیا وہ انسانیت کا مصلح اور پیشوا کہا جاسکتا ہے - ابھی صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے ادیب عموماً کس ماحول میں رہتے آے ہیں کیونکہ ہمارے تجزیہ کے مطابق اُن کے جذبات کی شکل اسی ماحول میں ہوئی - کیا یہ ماحول اور یہ جذبات زندگی کے لئے چراغ راہ بن سکتے ہیں ؟ اب زندگی کو کس طرف جانا چاہئے اور ہمارا ادب کس طرف جارہا ہے ؟

زمانۂ قدیم اور عہد وسطیٰ بلکہ گزشتہ صدی کے اواخر تک علم و ادب پر دو قسم کے لوگوں کا اجارہ رہا ہے - ایک وہ جو بیراگی یا صوفی تھے اور دوسرے وہ جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتے تھے اور زندگی کی تگ ودو سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا - آشرموں یا حجروں میں اور درباروں یا امیروں کی ڈیوڑھیوں میں پڑے ہوے یہ عالم اور ادیب زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کیا کرتے تھے - وہ ایک ایسے ماحول میں رہتے تھے جو یا تو زندگی سے دور تھا اور یا جھوٹی زندگی کا عکاس تھا - سوچیئے کہ دربار یا آشرم میں رہ کر انسان کِن جذبات کی ترجمانی کِن کی زبان میں کرے گا - ایک محدود دائرے میں رہ کر جہاں ایک سے لوگ ایک قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں ، جہاں حزنیت یا منافقت کا دور دورہ ہے — وہاں کسی ادیب کی حالت کیا ہوگی ! اس لحاظ سے ہمارے ادب قدیم کے تین نقائص اتنے نمایاں ہیں کہ حاشا تشریح طلب نہیں :

۱ - موضوعات ادب بہت ہی فرسودہ اور محدود ہیں -

۲ - لطف بیان اور زیب داستاں پر معنی و مقصد قربان کئے جاتے ہیں -

۳ - ادب کو لوگ پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں -

تاریخ بتاتی ہے کہ اس ملک کا ادب ہر دور میں طبقۂ امرا کا خادم اور منت پذیر رہا ہے - کچھہ صوفی شاعر اور عہد وسطیٰ کی 'بھگتی تحریک' کے علم بردار ادیب ایسے ضرور ہوے ہیں جو امیروں کے دست نگر نہ تھے لیکن ان میں سے اکثر دنیا سے بیزار اور بے نیاز تھے جس کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے - کبیرداس اور نظیر اکبرآبادی جیسے شاعر خال خال ہی ہوے ہیں جو گھوم پھر کر آپ اپنی روٹیاں کماتے' اور زندگی کو کوچۂ یار میں رہ کر نہیں بلکہ قدرت کے نگار خانے میں رہ کر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے - ان درباری بھاٹوں اور بے غیرت عاشقوں کے متعلق طالسطائی کہتا ہے :

" کیونکہ ان کا پیشہ امیروں کی خوشنودی ہے اس لئے ان میں خودداری کا احساس باقی ہی نہیں رہتا - قبول عام کی ہوس میں یہ اندھے ہوجاتے اور مدح و ثنا پر اپنا دین و ایمان نثار کردیتے ہیں - یہ دیکھہ کر کتنا افسوس ہوتا ہے کہ آرٹ کی خاطر یہ زندگی کے لئے بیکار تو ہو ہی جاتے ہیں لیکن یہ بہ ایں ہمہ آرٹ کو فائدہ کیا الٹا نقصان پہنچاتے ہیں - علاوہ بریں یہ لوگ امیروں کی غیر فطری زندگی کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ بیزار ہوکر مر نہیں جاتے بلکہ حسن و عشق کی دنیا میں اپنی روح کو تلاش کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کرتے ہیں - امیروں کو آرٹ یہ تلقین کرتا ہے کہ انسان نیکی کے لئے نہیں بلکہ حسن پرستی یعنی عیاشی کے لئے زندہ ہے - امیروں کے زیر سایہ جو غریب رہتے ہیں وہ بھی ان مکروہ جذبات سے

اثر پذیر ہوے بغیر نہیں رہ سکتے جن کی ترجمانی آرٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں وطن پرستی اور اوباشی کے اثرات سرعت سے پھیلتے جاتے ہیں ۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے کے آرٹ کا وہی حشر ہوا جو ایک عشوہ فروش ہر جائی کا ہوتا ہے ۔ آرٹسٹ فصاحت و بلاغت' عبارت آرائی اور رنگین بیانی میں اپنی ضمیر فروشی اور نفس پروری کو چھپاتا ہے' طوائف روغن و غازہ سے اپنی بد صورتی پر پردہ ڈالتی ہے ۔ غرض کہ ہمارے زمانے اور ہمارے طبقے کے آرٹ اور کسی کسبی میں ذرا فرق نہیں ۔ یہ تشبیہ لفظ بہ لفظ صحیح ہے — آرٹ اتنا ہی خود فروش' سیاہ باطن اور فریب کار ہے ! "

یہ باتیں ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کے لئے زیادہ سچائی کے ساتھہ کہی جاسکتی ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی ادیب اور فن کار ہرزہ سرائی کرتے رہے ہیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ ہمارے ادب کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ رہی ہے۔ زمانۂ حال کا سحر طراز ادیب روماں رولاں ادب کے اس رویہ کے خلاف احتجاج کرتا ہوا کہتا ہے ۔ " پچھلی صدی کے ادیبوں اور فن کاروں نے سماج کے ضمیر کو سلا دیا ہے ۔ سماج کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے انہوں نے لوگوں کو نئے نئے بہانے سکھا دئے ہیں اور حقیقت سے بچنے کے لئے نئے نئے بت خانے کھڑے کئے ہیں۔ ان کی تاویلوں کے بعد ہر شخص کے لئے یہ کہنے کی گنجائش پیدا ہوگئی ہے کہ سماج کے مظالم اور ستم خیزیوں کے لئے میں ہرگز ذمہ وار نہیں ہوں ! "

آج ادیبوں کی حالت کیا ہے ۔ جو پیشہ ور ہیں وہ فلم کمپنیوں' جاہل کتب فروشوں اور تن آسان ناظروں کے ساتھہ خود کو بیچ رہے ہیں ۔

جو شوقیہ لکھتے ہیں وہ نہ زندگی کو سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں - زندگی کھیتوں اور کارخانوں میں ہے نہ کہ آرام کرسیوں اور آراستہ ایوانوں میں - پھر جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے فرائض و مقاصد کم از کم ایک معمولی انسان جیسے تو نہیں انہیں ان خوش گوار حالات کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے تو یہ بندگان خدا 'ادب براے ادب' کی دھائی دینے لگتے ہیں - مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے لیے زندہ ہیں! ٹوپیوں اور جوتیوں کی طرح بازار کی ضرورت کے لحاظ سے کتابیں لکھتے ہوے اور مشاعروں کی تحسین و آفرین اور امیروں کے مہر و کرم کے خیال سے تک بندی کرتے ہوے بھی یہ لوگ بیباکی سے کہتے ہیں کہ آرٹ صرف انفرادی آزادی کی فضا میں پنپ سکتا ہے - انہیں مخاطب کرکے (لینن، اپنے اخبار نوواژیجن میں ایک جگہ لکھتا ہے : " ہم ادب کو کامل طور پر آزاد کرنا چاہتے ہیں - صرف سیاسی بندشوں سے ہی نہیں بلکہ دولت اور خود غرضی کی پابندیوں سے بھی ہم اسے آزاد کر دیں گے - یہی نہیں بلکہ ہم اسے سرمایہ دارانہ انفرادیت کا خادم بھی نہ رہنے دیں گے) —

یہ آخری الفاظ ناظرین کو متضاد معلوم ہوں گے - ممکن ہے کہ کوئی آزادی کا پرستار ادیب چیخ اُٹھے کہ تم سماج کی چکی میں آرٹ کو پیسنا چاہتے ہو، تم اس تخلیقی صلاحیت کو معدوم کرنا چاہتے ہو جو مکمل انفرادی آزادی کی فضا میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے - میں کہتا ہوں کہ یہ لمبے چوڑے دعوے تمہاری منافقت کے ثبوت ہیں - جس سماج کی بنیاد کیسۂ زر پر رکھی گئی ہے، جہاں معدودے چند سیٹھ عیش اور مزدور فاقہ کشی کرتے ہیں، وہاں آزادی کا ذکر تک مضحکہ خیز ہے - میں مصنفوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ سرمایہ دار پبلشروں کے دست نگر نہیں ہیں ؟

کیا وہ عیاش طبع ناظرین کے زیر احسان نہیں ہیں جو ننگی تصویروں کے دلدادہ ہیں کیا ان کی خاطر 'ادب برائے ادب' میں طوائفوں کا ذکر مسعود نہیں کرنا پڑتا ؟ سماج میں رہتے ہوے آپ سماج سے الگ نہیں ہو سکتے - کسی سرمایہ دار مصنف ' آرٹسٹ اور ایکٹر کا دعوئی آزادی — اُس کی جہالت کا پردہ ہے ! "

صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اُس سے اثر قبول کر سکیں - اس کے لئے دل میں خدمت خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہئے کیونکہ ادب پیغمبری کی طرح خود گزاری کا مقتضی ہے نہ کہ ملائیت کی طرح پیشہ ور! ماضی ' حال اور مستقبل کو سمجھنا ادیب کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی دردمندی رائیگاں نہ جائے اور وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھا سکے - پھر زندگی کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب اس کی آگ میں تپا جائے اور اس کے ہنگاموں میں حصہ لیا جائے - اس کی تگ ودو سے الگ رہ کر اس کے رموز کو سمجھنے کی کوشش ویسی ہی ہے جیسے ساحل پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کا اندازہ لگانا - اس صورت میں نہ ادیب زیادہ لوگوں کے احساسات کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اپنی زبان اور پیام اُن تک پہنچا سکتا ہے - یہ معیار بہت بلند اور مشکل معلوم ہوگا اس لئے کہ اب تک ادب پر اس جماعت کا قبضہ رہا ہے جو کسی راجہ کے مشہور درباری کی طرح ندی کی لہریں گننے کی تنخواہ لیا کرتا تھا —

پوچھا جائے گا کہ ادبا و شعرا کون سی راہ اختیار کریں - اپنے تخئیل اور تخلیق کی باگ کس طرف موڑیں کہ زندگی کی شاہراہ سے آملیں جس سے ہنوز وہ بہت دور رہے ہیں - روس کا مشہور مفکر ' پرنس کروپاٹکن '

جواب میں کہتا ہے : " اگر تمھارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے ' تمھارے جذبات کا رباب اُن کے دکھہ سکھہ کے ساتھہ ہم آھنگ ھوتا ھے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام کو سن سکتے ھو — تو تم ھر قسم کے ظلم کے مخالف ھوجاؤ گے ! جب تم کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کروگے ' جب تم میدان جنگ میں لاکھوں بے گناھوں کے لاشے تڑپتے دیکھوگے ' جب تمھارے بھائی بند قید و بند اور دار و رسن کے مصائب جھیلتے نظر آئیں گے ' اور جب تمھاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتح یاب ھوگی — تو ادیبو اور شاعرو ' اگر تم انسان ھو تو ضرور آگے آوگے ! تم ھرگز خاموش نہیں رہ سکتے - تم مظلوموں کی طرف داری کروگے کیونکہ حق و صداقت کی حمایت ھر انسان کا فرض ھے - "

ھر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ھے کہ قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ھٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے)- اُسے رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت و مساوات کی حمایت کرنی چاھئے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاھیے جو دریاے زندگی کو چھوٹے چھوٹے بچوں میں بند کرنا چاھتے ھیں - کیا زمانۂ حال کا ادیب یہ کرے گا؟ اب تک وہ قدامت اور رجعت ' خود پرستی اور ظلم پروری کا ساتھہ دیتا رھا ھے جس کی مثالیں ھم نے مضمون کے دوسرے باب میں پیش کی ھیں - گو یہ تبصرہ مختصر ھے تاھم مجھے یقین ھے کہ غور و فکر کے لیے تھوڑا سا سامان ضرور مہیا کرے گا —

قدیم ادب ہند کا معاشی تجزیہ

پلاسی کی لڑائی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں کی ٹکر تھی - اس کے بعد پورے ایک سو سال تک ہندوستانی سماج کا شیرازہ منتشر ہوتا رہا اور سنہ ۵۷ ع کی آخری کشمکش کے بعد سامنتی تمدن نے ہتھیار ڈال دیے - اور یہ معلوم ہوگیا کہ کرگھوں اور ہلوں کے دن گئے اور مشینوں کا زمانہ آگیا - تاہم حرفتی تمدن کا اثر سنہ ۵۷ ع کے بعد زیادہ نمایاں ہوا جس کی گونج پہلے راجہ رام موہن راے کی مغرب دوستی اور بعد ازاں سر سید کی انگریز پروری میں سنائی دی - ہندوستان کی زندگی میں انقلاب سا آگیا جس کی رو میں پرانی روشنی کے چراغ گل ہونے لگے - جیسا کہ عرض کرچکا ہوں میں نے اسی اعتبار سے ادب ہند کے دو دور مقرر کیے ہیں - کیونکہ اس سے پہلے ہزاروں سال تک ہمارے سماج کی حالت یکساں رہی - پیداوار کے ذرائع ایک سے رہے اور تقسیم کے اصولوں میں بھی کوئی فرق نہ آیا - مقامی حالات میں عارضی طور پر خیرات یا قحط کی وجہ سے یونہی سی تبدیلی ہوجاتی تھی ورنہ وہی آسمان تھا اور وہی زمین —

دنیا کے ہر گوشے میں سامنتی تمدن طبقۂ امرا پر رزم اور بزم کے نقوش چھوڑ جاتا ہے - اس کی پوری زندگی خون آشامیوں یا رنگ رلیوں میں گزر جاتی ہے - ہند قدیم کی تہذیب عوام اور امرا کو مذہبی اعتبار سے بھی دو طبقوں میں بانٹتی اور علم و ادب * کو صرف برہمنوں کا

* علم و ادب —— Knowledge & Literature

اجارہ قرار دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ کشتریوں اور ویشیوں میں بھی علم و فن کے چرچے ہونے لگتے ہیں لیکن عوام الناس یعنی شودروں کو نہ انہیں حاصل کرنے کی فرصت ہے نہ اجازت - بیچارگی سے قناعت اور اس سے قسمت پرستی عبارت ہے اور پچھلے جنم کے ناکردہ گناہوں کے لیے شرمساری اور اگلے جنم کی کامرانیوں کا خیال خام ان میں رس جاتا ہے - پوری سنسکرت اور ہندی شاعری کو چھان ڈالیے، اساطیر اور افسانوں کا ورق ورق الٹ جائیے، شاذ و نادر ہی کہیں عوام کا ذکر آتا ہے اور وہ بھی نفرت و حقارت کے ساتھ - البتہ راجاؤں کو رعایا پروری اور عدل گستری کی تعلیم دی جاتی ہے کیونکہ رعایا کی خوشنودی ہی قیام حکومت کی ضامن ہے - سنسکرت کے قواعد ادب اُسے لازم قرار دیتے ہیں کہ ہر ادبی تصنیف دیوتاؤں کے علاوہ حکومت اور برہمن جماعت کی دعاے خیر کے ساتھ شروع ہو - برہمنوں کی خداداد برتری اور کشتریوں کے اختیار حکومت کو بار بار دوہرایا جاتا اور ان سے سرکشی کرنے والوں کو جہنمی اور لعنتی قرار دیا جاتا ہے - شودروں کو بار بار ٹوکا جاتا ہے کہ اونچی جاتیوں کی خدمت ان کا فرض منصبی اور دین و ایمان ہے - منیوں اور دیوتاؤں کی نگۂ کرم ہمیشہ روح اور جسم کے خداوندوں کے لیے مخصوص ہے اور ہندو ادب ان کی مدح و ثنا سے لبریز ہے - 'شرنگار رس'، اور 'شانت رس' سنسکرت شاعری پر چھاے ہوے ہیں کیونکہ ایک امیروں کے صنفی رجحان کو پرچاتا اور دوسرا بوڑھوں کے احساس گناہ کو کم کرتا ہے - خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ فضا ٹریجیڈی کے تذکرے تک کی متحمل نہیں اور اسے مخدوش سمجھتی ہے، چنانچہ ہر سنسکرت ٹریجیڈی خواہ مخواہ کامیڈی میں منتقل کردی جاتی ہے !

اس سماج کا یہ طبقہ کس حد تک عیش و طرب میں ڈوبا ہوا بزم کی رنگینیوں کی داد دے رہا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس زمانے کے ادب کو دیکھیے - اکثر سنسکرت افسانے مثلاً 'دش کمار چرتر' بیتال پنچشت (بیتال پچیسی) اور 'مرچھہ کٹکا' (مٹی کی گاڑی) وغیرہ ڈرامے بد اخلاقی، اوباشی اور قابل نفرت جنسی فساد سے بھرے پڑے ہیں - شاعر اور ادیب انھیں یوں مزے لے لے کر بیان کرتا ہے گویا زندگی کے فرائض یہیں ختم ہو جاتے ہیں - عشقیہ شاعری کے لیے جو ہم معنی لفظ 'شرنگار' ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت اور بوالہوسی میں کوئی امتیاز نہ تھا - ہندو اصناف سخن میں 'نائیکہ بھید' اور نکیہ شکیہ ورنن یعنی اقسام معشوق کی شرح اور معشوقہ کے سراپا کو جو مرتبہ و مقبولیت حاصل ہے وہ اس کی شہوت پرست ذہنیت کا پرتو ہے - نائیکہ بھید میں جس تجسس اور انہماک سے صرف کنواری ہی نہیں بلکہ شادی شدہ عورتوں کی بدکاریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس فضا کا اخلاقی معیار کیا تھا - شعر و ادب اس فضا کے لیے قوت باہ کی گولیوں کا کام انجام دیتے تھے - اس زمانے میں طبقۂ امرا کی حالت کیا تھی اس کا اندازہ لگانے کے لیے مہابھارت کے کچھ واقعات پر غور کرنا دور از مبحث نہ ہوگا ـــ

جب ارجن نے کرشن جی کی بہن سبھدرا سے بیاہ کیا تو انھیں جہیز میں ایک ہزار حسین و جمیل دوشیزائیں دی گئیں! یودھشٹر نے جب 'راجسویہ یگیہ' کیا تو انھیں راجاؤں نے ایک لاکھ حسینوں کے پارسل بھیجے! کرشن جی کی ۱۶ ہزار گوپیوں کا قصہ ممکن ہے کہ مبالغہ ہو لیکن مہابھارت اور بھاگوت میں ایسے صدہا واقعات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے حرم میں ہزاروں عورتیں رہتی تھیں - یہی نہیں یودھشٹر کے

'دھرم راج' میں ۸۸ ہزار طلبا کی ضروریات حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں اور ان میں سے ایک اہم جنس یہ تھی کہ ہر طالب العلم کی خدمت کے لئے ۳۰ دو شیزائیں مقرر تھیں - لطف یہ ہے کہ مہا بھارت کا مصنف کہیں اشارتاً بھی اس شہوانی گرم بازاری کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا - یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ عہد قدیم اس قسم کی بزم آفرینیوں سے جگمگا رہا ہے ! اس زمانے کے لوگ تاریخ نویسی سے بے بہرہ تھے' شعر و ادب میں ہی راوی نے چٹخارے بھر بھر کر یہ کہانیاں سنائی ہیں - یہ اس زمانے کی زندگی کا بزمیہ پہلو اور عشقیہ شاعری میں اس کا عکس ہے - اب ششوپال ودہ راماین وغیرہ رزمیہ نظموں کو دیکھیے - قتل و غارتگری کا کوئی اثر قسم کھانے کے لیے شاعر پر نہیں ہوتا - حتیٰ کہ والمیک اور تلسی داس تک لنکا کی تباہی اور لاکھوں انسانوں کے تہ تیغ ہونے پر اظہار تاسف نہیں کرسکے بلکہ بیواؤں کی آہ اور یتیموں کی فریاد پر یہ لوگ خندہ زن ہیں !

ملک کی آبادی کا ۹۵ فی صدی حصہ کسانوں پر مشتمل ہے لیکن میں نے آج تک کسی قدیم سنسکرت یا ہندی تصنیف میں ان کے حالات نہیں دیکھے - جابجا درندوں اور پرندوں کے رنج و راحت کا حال ہے لیکن کسانوں کا نام تک کہیں نہ ملے گا - کبھی کوئی نیک طینت وزیر راجا کے آگے "پرجا" کی تکالیف کا دکھڑا روتا ہے یا کوئی راجا خیرات کرتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں 'رعایا' نام بھی کوئی چیز تھی - ورنہ 'مانیوں' 'راجاؤں' بنیوں اور حسینوں کے تذکرے اس کثرت سے ملینگے کہ یقین سا ہوجاتا ہے کہ اس جنت نشان میں ان کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا تھا !

کالیداس اس عہد کا مایۂ ناز ادیب اور شاعر ہے - اس کی سحر طرازی اور جادو بیانی کا لوہا مشرق و مغرب میں سب نے مانا ہے - منظر کشی اور تصویر نگاری میں وہ اپنا مقابل نہیں رکھتا - ایشیا کے شاعروں پر بجا طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا بیانیہ کلام تناسب سے دور ہوتا ہے - ایک کالیداس ہے جس کا ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جہاں جم گیا وہاں سے اُٹھ نہیں سکتا - کالیداس کی یہ حیثیت ہمیشہ قائم رہے گی - لیکن ماحول کا جیسا اثر جذبات پر پڑتا ہے اس کی سبق آموز مثال یہی شاعر بے ہمتا ہے - اس کے آگے انسانیت کا مقصد اگر کچھ ہے تو محض یہ کہ نیک دیوتاؤں، رحم دل راجاؤں اور ہٹ دھرم رشیوں کی پوجا کرے - شکنتلا میں جا بجا برہمنوں کی عظمت کا اعلان کیا گیا ہے ' رگھوونش' میں رام چندر جی کے اجداد کی فوج کشی اور بزم آرائی کا ذکر ہے - قدرت کے استبداد اور سماج کے مظالم کے خلاف وہ بھی کچھ نہیں کہتا اور اس کے کردار ایک ہی طبقے میں رہتے اور ایک ہی ماحول میں پرورش پاتے ہیں —

کیونکہ ' ویدک ' عہد میں آرام و آسائش کے سامان کم تھے اس لیے اس زمانے کی شاعری بھی تصنع سے پاک ہے - رفتہ رفتہ جاہ و حشمت کے طلسم کھڑے ہوتے اور عیش و طرب کے نئے نئے سامان مہیا کیے جاتے ہیں - ادب و شعر اس عروج یا زوال کی جو تصویر کھینچتے ہیں اس میں معنی آفرینی کی جگہ ندرت بیان اور لفظی بندشیں لے لیتی ہیں - یہ امر قابل غور ہے کہ علم بیان و معانی کے لیے سنسکرت میں ' النکار ' کا لفظ ہے جو ' زیور ' کا ہم معنی ہے - عبارت آرائی و رنگین بیانی کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے کہ ادب آخر میں پہیلیاں بجھوانے لگتا ہے - چنانچہ ' بان بھٹ ' کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کو یوں ترکیب دیتا ہے کہ ایک ایک لفظ ۲۶-۲۶

سطروں تک پھیل جاتا ہے اور تشبیہ و استعارے کے بیان میں اتنی بلند پروازی کرتا ہے کہ مطالب چیستاں بن کر رہ جاتے ہیں - ایک خاص صنف سخن 'بھر مر چھند' ہے جس کی مثال مہا بھارت اور سورداس وغیرہ کے ہندی کلام میں ملےگی - اب تک سخن سنجوں میں یہ بحث ہوتی ہے کہ اُن سے شاعر کی مراد کیا ہے - غرض ایسے لفظی تکلفات سے وہ تمام شاعری بھری پڑی ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا - شاعر کے مشاہدات اور احساسات اسے آگے بڑھنے کی اجازت کیوں کر دیتے - ایک خاص بات یہ ہے کہ اس زمانے میں شاعر روح اور جسم میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا اور نہ دوئی کے پردے کو چاک کرنے کی سعئی رائیگاں میں وقت گنواتا ہے - وہ اس زندگی اور اس کی لذتوں کے لیے زندہ ہے اور اسی وجہ سے 'بھرتھری' جیسے دو چار بیراگیوں کو چھوڑ کر حزنیاتی رنگ کم ملے گا اور تصوف کا تو کوسوں پتا نہیں ہے !

'پنچ تنتر'، 'ہتوپدیش' اور 'مدرا راکشس' وغیرہ میں ہمارے لیے ایک جہان عبرت پنہاں ہے کیونکہ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے طبقۂ امرا اور علماے سو کا اخلاق کتنا پست اور انسانیت سوز تھا - مگر افسوس تو اس پر ہوتا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ذمے یہ خدمت لے لی تھی کہ ان بدعنوانیوں کو ایسی ساحرانہ رنگ آمیزی سے بیان کریں کہ دیکھنے والا نفرین کے بدلے آفرین کہے اور کف حسرت ملے کہ ہم ان محفلوں میں کیوں نہ شریک ہوسکے !

مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہندو سماج کی ذہنیت جس طرح بدلی اُس کے دو بین اثرات ہندی شاعری میں موجود ہیں - ایک تو رزمیہ اور جوشیلی نظموں کی مقبولیت - 'پرتھوی راج راسو' 'ہمیر راسو

اور "آلہا اودل" وغیرہ اس زمانے کی نظمیں ھیں - بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں جب ھندوؤں کے خفتہ جذبۂ قومیت میں ھیجان پیدا ھوا تو شیواجی اور درگا داس جیسے سورماؤں کے ساتھہ 'بھوشن' اور "رام داس جیسے شاعر بھی پیدا ھوے جنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ھندوؤں میں بڑا اشتعال پھیلایا - پچھلے دنوں جب اس ملک میں ھندو مسلم فساد کی آندھی امنڈی تھی تو یہ دونوں فرقہ پرست شاعر قبر میں کروٹ بدلنے لگے تھے —

ھندو مذھبی پیشواؤں کے آگے یہ مسئلہ بھی پیش تھا کہ اسلام کے نرغے سے ھندو عوام کو کس طرح بچایا جاے جو برھمنوں اور پنڈتوں کی دست برد سے عاجز تھے - اس جد و جہد کا اظہار شاعری میں کبیر داس 'دادو دیال' اور تکارام وغیرہ بھگت شاعروں نے کیا - انہوں نے روزمرہ کی زبان میں سمجھایا کہ سارے فساد مذھبی دلالوں کی وجہ سے شروع ھوتے ھیں اور بھگوان کی نظر میں سب انسان برابر ھیں - کبیر داس ھندوستانی جنتا (Masses) کا پہلا اور سب سے بڑا شاعر تھا جس نے امیروں اور پنڈتوں سے بے نیاز ھوکر عوام میں خودداری اور خود احساسی کے جذبات پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی - کیونکہ وہ اور اس کے معاصرین امیروں کی نہیں بلکہ غریبوں کی زبان میں گفتگو کرتے ھیں' اس لیے ان کا کلام ھر طرح کے الٹے تللوں سے پاک ھے - یہ صحیح ھے کہ گوشہ نشین اور سادھو منش ھونے کی وجہ سے یہ شعرا موت کو زندگی پر ترجیح دیتے اور لوگوں کو زندگی کی تگ و دو سے الگ رھنے اور جسمانی تفکرات سے بے پروا رھنے کی نصیحت کرتے ھیں - چنانچہ کبیر داس ایک جگہ مارٹن لوتھر سے ھمنوا ھوکر کہتا ھے کہ پرجا راجا بن جاے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا؟

روحانی تسکین کے لیے وہ جسمانی تسکین کو ضروری نہیں سمجھتا —

عشقیہ شاعری کا عنصر ہندو ادب پر اب بھی اتنا ہی غالب ہے جتنا عہد قدیم میں - بنگال میں 'چنڈی داس' بہار میں ودیا پتی اور برج بھاشا میں بہاری 'دیو' متی رام وغیرہ سماج کی اس بے حرکتی اور بے حسی کے نقاش ہیں جو مسلمانوں کے آنے اور یہاں جم جانے کے بعد پیدا ہوگئی تھی - پھر بھی ان میں سے اکثر فطرت اور عوام کے قریب رہتے ہیں' اردو شاعروں کی طرح نوابوں اور معشوقوں کے در پر نہیں پڑے رہتے' لہذا ان کا عشق ایسا بیہودہ نہیں جیسا ان کے مسلمان متاخرین کا - تاہم کوئی نصب العین اور مسلک نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی 'کرشن' اور گوپیوں کے تذکرے سے آگے نہیں بڑھتے جس سے ان کا محدود زاویۂ نگاہ ظاہر ہوتا ہے - میرا خیال ہے کہ اگر 'کرشن جی' پیدا نہ ہوتے تو شاید قدیم ہندی شاعری کا بڑا حصہ نہ لکھا جاتا - یہ ہندو طبقۂ امرا کی ذہنیت کا اظہار ہے جسے بڑھاپے میں اپنے بچپن کے افسانے سننے میں لطف آتا ہے - رام اور کرشن کی فتوحات میں یہ لوگ ظالموں کی شکست کا خواب دیکھ رہے ہیں —

اردو ادب کے دور قدیم پر کچھ کہنے سے پہلے دو تین باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں - ایک یہ کہ اردو ادب کا پیش منظر ایرانی ہے - عروض' بیان' معانی' تشبیہ و استعارات اور اساطیر ہی نہیں تقریباً تمام اردو شعرا کی ذہنیت بھی غیر ملکی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایرانی دس سال عرب میں رہنے کے بعد ہندوستان آیا اور یہاں کی زبان میں شاعری کرنے لگا - وجہ ظاہر ہے - مسلمان حکمراں طبقے اور عوام کے مابین ایک سد سکندری قائم تھی - حضرات شعرا میں سے کم ایسے

ہوے ہیں جو دیہاتوں اور جنگل پہاڑوں کی سیر کرچکے ہوں - شہروں میں اور وہ بھی محبوب کی گلیوں اور نوابوں کے آستانوں میں ان کی عمریں گزر جاتی ہیں - 'درد' اور 'نظیر' جیسے شاعر کم ہوے کہ جنھوں نے شاعری کو اپنا پیشہ نہ بنا لیا ہو ۔ جب شاعری ایک جنس سمجھہ لی جاے تو اُسے بازار کے خرید و فروخت کے اصولوں کے ماتحت رہنا پڑتا ہے اور چونکہ اس کے خریدار صرف دولت مند ہوتے ہیں لہذا ان کے ذوق و طبیعت کا پاس لازمی ہے ورنہ میر تقی میر کی سی حالت ہوجاے - اب درد جیسے صوفیوں کو دیکھیے کہ دنیا سے الگ رہتے اور نظم میں عبادت کرتے ہیں - ممکن ہے کہ حیات بعدالموت کے مسائل کے لیے اُن کی راہبانہ شاعری مفید ہو ورنہ جہاں تک اس زندگی اور اس کے ارتقا کا سوال ہے ' اس قسم کی شاعری 'کرم' اور 'قسمت' کے اصولوں کی طرح عوام کے لیے مضر اور جوش عمل کے حق میں نشہ آور ہے —

اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ قصائد پر مشتمل ہے جن پر کچھہ کہنا لا حاصل ہے - قصیدہ خواں شاعر ایک ایسا مصاحب ہے جو مقفیٰ تک بندی کرلیتا ہے - غزل گوئی میں اظہار واردات کا دائرہ اتنا محدود رہ جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھہ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشین ایک رفتار سے ایک سی آواز کرتی چلی جارہی ہے - اب ان متمول اور متوسط طبقوں کے ماحول کو دیکھیے جس میں لوگ روز ایک ہی طرح کے کام کرتے ہیں - ان کے مشاغل اور دلچسپیوں میں کبھی فرق نہیں آتا تھا - آمد و رفت کے ذرائع کم ہونے کی وجہ سے سفر کی نوبت بھی کم آتی تھی - نہ اخبارات شائع ہوتے تھے اور نہ خطوط آسانی سے آجاسکتے تھے تاکہ باہر کے حالات معلوم ہوسکیں - اس بے رنگ و بو

زندگی کی جھلک غزل کی مقبولیت کی صورت میں نمایاں ہوئی- معشوق سے ہم کلام ہونا — یہ دوسری بات ہے کہ وہ عرش آشیاں تھا یا فرش نشیں — اردو شاعر کا سب سے اہم فریضہ تھا! بجز مثنوی اور مرثیے کے دوسرے اصناف سخن کی زبوں حالی اس طبقے کی کم نگہی اور محدود خیالی کی دلیل اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے کی اردو شاعری امیروں کی تفریح کے سوا کوئی کام انجام نہ دے سکی - اس میں دو رجحانات زیادہ واضح ہیں - ایک تو 'معشوق حقیقی' سے خطاب اور جسم کی قید سے آزادی کے لیے روح کی بے کلی - یہ صوفیوں کی ترجمانی ہے جو نام نہاد مسلمان امرا کی عیش کوشی اور منافقت سے تنگ آکر دنیا سے بیزار ہوگئے اور ایک جہان نو کی طرح ڈالنے لگے - غربت اور افلاس کی وجہ سے جن شاعروں کی پہنچ محفل جاناں میں نہ ہوسکتی تھی' انہیں بھی اچھا بہانہ ہاتھ آیا اور وہ جمال باری کے آئینے میں جلوۂ یار دیکھنے لگے!

فتح ہند کے بعد ہی مسلمان امرا اور علما میں تنازع شروع ہوگیا تھا - مذہبی جماعت امور سلطنت میں دست اندازی کی متواتر کوشش کرتی رہی جس میں اسے سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا - مولویوں نے رئیسوں کو احتساب کی تلقین کی بلکہ کئی مرتبہ مے خانوں پر پہرے بھی لگادیے' جس کی وجہ سے عیش پسند اور رند مشرب ان سے سخت ناراض رہنے لگے - چنانچہ فارسی اور اردو شاعری میں عام طور پر محتسب' زاہد اور شیخ کی جس بری طرح خبر لی گئی ہے شاید بولشیوک شاعروں نے سرمایہ دار معشوقوں کو بھی اتنا نکو نہ بنایا ہوگا - در اصل یہ اس ماحول کی رند روشی اور احتساب و شریعت کی پابندی سے بیزاری کا اظہار ہے -

تاریخ شاہد ہے کہ عہد وسطیٰ میں عموماً اور اورنگ زیب کے بعد خصوصاً

مسلمانوں کے زوال کے ساتھہ سماج میں ایسی ابتری پھیل گئی جس کی مثال نہیں ملتی - دلی اجڑنے لگی اور لکھنؤ کی چمن بندی شروع ہوئی - نادر شاہ ابدالی اور مرھٹوں کے حملوں نے دلی کو جیسا خستہ و خراب کیا اس کا اضمحلالی اثر میر درد اور دلی اسکول کے دوسرے شاعروں پر کم و بیش نمایاں ہے - لکھنؤ کی خوشحالی اور خوش باشی کا اثر وہاں کے شاعروں پر جیسا کچھہ پڑا اُس کے آئینہ دار 'امانت' 'رشک' 'رند' اور جان صاحب' وغیرہ ہیں - 'آتش' ان سے کسی قدر الگ ہے کیونکہ دوسرے لکھنوی شاعروں سے اس کی زندگی مختلف ہے —

تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کتنے بے خبر اور بے پروا تھے، ان کے جذبات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے' اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے - پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا قومی سانحہ تھا، پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیام موت تھی، تیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا - اور ان سب سے اہم سنہ ۵۷ ع کا سانحہ تو ہندوستانی سماج کی بربادی کا پیش خیمہ تھا - کتنے شاعروں نے ان خونچکاں واقعات کو نظم کیا؟ کتنے نوحے لکھے گئے؟ کہاں تھے وہ رجزگو مرثیہ خواں جن کی جادو بیانی سے محرم کی ہر محفل ماتم کدہ بن جاتی تھی؟ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی * پر ایک نوحہ نہ لکھا - واقعۂ سنہ ۵۷ع پر داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت

* گذشتہ صدی کے آخر میں جب بنگالیوں میں قومیت کا احساس پیدا ہونے لگا تو اس سانحے پر ان کے شیریں مقال شاعر نوین چندر سین نے ایک ولولہ انگیز نظم بعنوان "پلاسیر یودھ" لکھی - اسی طرح اسی موضوع پر بنگال کے مشہور شاعر نذر الاسلام نے بھی ایک نظم قلمبند کی ہے واقعہ سنہ ۵۷ ع پر منیر شکوہ آبادی کے کچھہ کلام اور شاہ ظفر کی کچھہ غزلوں کو مستثنی سمجھنا چاہئے -

کا فیصلہ ہو رہا تھا' یہ حضرات اپنی روٹیوں کے سوا کچھہ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزلادنہ اور رجعت پرورانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لیے باعث ننگ ہیں ــ

اس ادب کی مثال امربیل سے دی جاسکتی ہے جو اُسی درخت کو فنا کرتی ہے' جس پر پرورش پاتی ہے - کیونکہ عہد قدیم کے تمام شاعر پیشہ ور تھے اور نوابوں اور راجاؤں کے منت کش تھے لہذا امیروں کے مفاد سے اُن کا اثر پزیر ہونا لازمی تھا - اُن کی خوشنودی کے لیے اُن کی زبان میں بولنا بھی ضروری تھا اور بعد میں تو زبان دانوں کے معرکے بٹیروں کی پالی کی طرح عام ہو گئے - اردو زبان میں بال کی کھال جس طرح نکالی گئی شاید اس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہ ملے گی - معنی پر زبان کو ترجیح دینا' اس طبقے اور اس کے لگے لپٹوں کے جھوٹے نظریۂ زندگی کا ثبوت ہے جو نظام زندگی پر سانپ کی کینچلی کی طرح چھائے ہوے تھے - اس صورت حال کو دیکھہ کر طالسطائی کے اس خیال سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "ہمارے سماج میں لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اگر کوئی آرتسٹ فکر معاش سے آزاد ہو جائے تو زیادہ بہتر کام کر سکتا ہے - یہ خیال میرے اس دعوے کی پرزور تائید کرتا ہے کہ ہم جس چیز کو آرٹ سمجھتے ہیں وہ ہرگز آرٹ نہیں بلکہ اس کی پرچھائیں ہے ! آرٹ اور صنعت میں بڑا فرق ہے - آرٹ فن کار کے ہیجانات کو دوسروں تک منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے - ہیجان اسی آدمی میں پیدا ہوگا جو ایک معمولی انسان کی طرح اپنی فطری زندگی کے ہر پہلو کو نشوونما حاصل کرنے کا موقع دیتا ہے - اگر فن کاروں کو مفت کی روٹیاں ملیں تو ان کی تخلیقی قوت برباد ہو جائے گی - کیونکہ پھر قدرت اور سماج سے خود حفاظتی کے لیے وہ کیسے لڑیں گے

اور ان مصائب کو کیوں کر سمجھیں گے جن سے فکر معاش میں ہر فرد بشر کو دوچار ہونا پڑتا ہے - اس طرح وہ سب سے اہم ہیجانات سے محروم رہ جاتے ہیں جو ہر آدمی میں کم و بیش موجود ہیں اور انفرادیت کے ارتقاء کے لئے ناگزیر ہیں - آج ہمارے سماج میں آرٹسٹ جس عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے ' اس سے زیادہ مضر ماحول کسی فنی تخلیق کے لئے ہو نہیں سکتا —

اردو شاعروں میں ' درد ' اور ' نظیر ' جیسے معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ وظیفہ خوار تھے - ' درد ' دنیا سے بیگانہ اور ' میر ' اپنی ناکامیوں کی وجہ سے زندگی سے بیزار ! اس لحاظ سے دونوں زندگی کے لیے ضروری جذبات کے اظہار سے اجتناب برتتے ہیں - افسردگی ' رہبانیت اور حزنیت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے' بدنصیبی اور ناکامی کے گلے ہیں ' حسرت و یاس کے افسانے ہیں - زندگی کی کش مکش سے الگ رہنے اور فطرت سے محظوظ نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان حضرات کو برائیوں کے سوا کہیں کچھہ نہیں دکھائی دیتا - چونکہ میں اظہار جذبات کو جذبات پر ترجیح نہیں دیتا ' اس لئے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کہتا کیا ہے ' کیسے کہتا ہے کا سوال بعد میں آتا ہے - ' نظیر ' کے یہاں حسن بیان کی کمی اور عامیانہ جذبات کی زیادتی ضرور ہے جس کی وجہہ اس کی آوارہ اور خانہ بدوش زندگی ہے - لیکن پورے اردو ادب میں وہی ایک ایسا شاعر ہے جو عوام کے ساتھہ رہتا ' انہیں سمجھتا اور اُن کے تاثرات کو انہیں کی زبان میں بیان کرتا ہے - اس زمانے کی زندگی کا معیار اتنا جاہلانہ تھا کہ ادیب سے زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی - اگر وہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر پیش کردے اور ساتھہ ہی قلب میں جذبۂ درد مندی رکھتا ہو تو

بہت ہے - اس لحاظ سے نظیر تلسی داس اور کبیر داس سے پیچھے ہے - تاہم وہ ایک عام شہری کی نظر سے دنیا کو دیکھتا اور اپنے آئینۂ زندگی میں وہ تمام خرابیاں دکھاتا ہے جو اسے نظر آتی ہیں - طور اور نجد کے تذکرے اُس کے کلام میں ناپید ہیں - وہ بوڑھوں، غریبوں اور فقیروں کے ساتھ رہتا اور انہیں قوت گویائی بخشتا ہے - افسوس کہ نظیر محنت کش نہ تھا ورنہ اس کا زاویۂ نگاہ بلند ہوتا - اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہندوستان کے ادب قدیم میں اسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہے - کبیر عوام کا مصلح ہے تو نظیر ان کا یار غار ہے - کاش یہ دونوں فقیر نہ ہوتے!

چند صفحات میں ہزاروں سال کے ادب کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا - ہم نے اپنے تجزیہ کے مطابق یہ اصول قایم کیا تھا کہ ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں - اچھے جذبات اچھے ماحول کے محتاج ہیں - پھر یہ بھی دیکھا کہ زندگی ارتقا بالضد کے زینوں سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہے اور ادب اس وقت تک زندگی کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہمدوش نہ ہو - ادیب کا فرض ہے کہ ماضی کے عیوب سے حال کو باخبر کرے اور حال کی تصویریں کھینچے کہ اس میں مستقبل کے لیے اشارات پنہاں ہوں - جب ہم نے اس روشنی میں ہندوستانی ادب کو دیکھا تو مایوسی اور شرمساری کے ساتھ ہم گورکی سے ہم آہنگ ہو کر چیخ اٹھے کہ "ماضی کے بت کو پوجنے والے شاعرو حال کی برائیوں کو چھپانے والے ادیبو اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگارو مت جاؤ ورنہ تاریخ تمہیں مٹا دے گی!"

اردو شاعری کے عیوب کے لیے کئی اسباب ذمہ وار تھے - ایک یہ کہ وہ اس زمانے میں پھولی پھلی جو مسلمانوں کی حکومت اور سامنتی تمدن

کے زوال کا دور تھا - جس طبقے نے اسے گود لیا وہ خود قعر مذلت میں پڑا ہوا تیزی سے بربادی کی طرف چلا جا رہا تھا - پھر اس کی تربیت ایسے ہاتھوں سے ہوئی جنھوں نے نان بائی کی دکان کی طرح اسے اپنی روٹی کمانے کا وسیلہ بنا لیا - یہ تو تھا ہی ساتھ ساتھ ایک تنگ نظر سوسائیٹی میں پرورش پاکر اس نے اپنے لیے عرصہ حیات تنگ کر لیا - سماج کے دباؤ اور اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے شاعر بہت کم موضوعات پر لکھہ سکتا تھا - ادب کا پودا آزادی کی ہوا میں ہی پروان چڑھے گا - پھر یہ بھی ہے کہ پودے کی بیجا سختی اور جنسی تشدد کی وجہ سے گلوے تغزل میں پھانسی کا پھندا سا پڑ گیا - اردو شاعری کی معشوقہ — اگر ایسی کوئی چیز ہے تو — ایک ہرجائی طوایف ہے اور سوچئے کہ اس سے کسی قسم کا لگاؤ شاعری کی نازک روح پہ کس قدر گراں ثابت ہوگا —

اس تجزیہ سے کسی کی تنقیص یا تضحیک مقصود نہیں - اس بحث کا ماحصل صرف یہ ہے کہ زندگی کی حفاظت اور ترقی کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اور کسی چیز کو اس پر فوقیت اور برتری نہیں دی جا سکتی - ادب زندگی سے عبارت ہے نہ کہ زندگی ادب سے - ادب کے نام پر جو چیز انسان کو زندگی سے بیزار ہونے کی تعلیم دیتی ہے انسان کو فوراً اس سے بیزار ہو جانا چاہیے - سچ پوچھا جائے تو اس دور کے تقریباً تمام آرٹسٹ ضائع ہوے ہیں - اس وقت تک صحیح معنوں میں آرٹ کا ارتقا ہوا ہی نہیں - کالیداس، کبیر، نظیر اور غالب وغیرہ کے سوا شاید کوئی ایسا شاعر نہیں جسے مستقبل کا انسان عزت سے یاد کرے گا —

هندوستانی ادب کے دور جدید کا معاشی تجزیہ
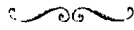
ہندوستانی ادب کے دور جدید پر ہم زیادہ تفصیلی نظر ڈالیں گے کیونکہ اس کا براہ راست ہماری نسل سے تعلق ہے اور اس کی ترکیب و تدوین ہمارے ہاتھوں ہو رہی ہے —

اشاروں اشاروں میں پہلے ہم یہ دکھلا چکے ہیں کہ سماج کی بنیاد افراد کے اقتصادی تعلقات پر منحصر ہے اور ان کے رشتۂ مادی کے اعتبار ہی سے کسی دور کی ذہنی و روحانی تحریکات کو سمجھا جا سکتا ہے - علاوہ بریں، ادب اب تک تعلیم یافتہ طبقے کا اجارہ رہا ہے اور اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے اس طبقے کے رجحانات کو پہچاننا بے حد ضروری ہے - سچ پوچھو تو ہمارے ادب کے سرچشمہ سے جو نئی نئی نہریں کٹ رہی ہیں وہ دراصل متوسط طبقے کی حالت کا پتا دیتی اور اس ذہنی رد عمل کو ظاہر کرتی ہیں جو ایک طرف تو حرفتی اور سامنتی تمدن کی کش مکش اور دوسری طرف ہندوستانی قومیت یعنی دیسی حرفت اور غیر ملکی ملوکیت کے تصادم کی وجہ سے ان میں پیدا ہوگئی ہے —

سنہ ۱۸۵۷ کے بعد انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانیوں کی ذہنیت میں سرعت سے ایک انقلاب ہوتا رہا کیونکہ انسان جب اپنے مادی

حالات میں رد و بدل کے لیے مجبور ہوتا ہے تو ان کے قبول کرنے کے لیے تاویلیں بھی پیدا کرلیتا ہے۔ مسلمان حکمراں طبقہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے برسر پیکار رہ کر انحطاط پذیر ہوچکا تھا اب اس کی پذیرائی کے لیے مجبور ہوا۔ چنانچہ علی گڑہ تحریک در حقیقت نئی تہذیب کی فتح کا اعتراف تھی۔ پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں جو تحریک شروع کی تھی سرسید نے اب اس کی تجدید مسلمانوں میں کی اور دونوں کا رد عمل قومی زندگی پر تقریباً ایک سا ہوا۔ جب نئی تہذیب کے نشے میں سرشار ہوکر ایک دو نسلیں بنگال میں نکل چکیں تو وہاں کے اکابر کو یکایک محسوس ہوا کہ انگریزی زبان اُن کی زندگی میں ناسور ڈال رہی ہے' درآں حالیکہ ناسور پہلے سے موجود تھا جسے یہ مغربی نشتر اب ابھار کر دکھا رہا تھا۔ سرکاری نوکریوں میں فرقہ وارانہ تمیزکی وجہ سے آہستہ آہستہ ہندو مسلم کی تفریق بڑھتی گئی۔ ادھر زندگی کے نئے نظریوں نے قدامت کا قلع قمع شروع کیا اور ضرورت ہوئی کہ پرانی شراب نئی بوتلوں میں ڈھالی جائے اور اس پر جدت کی چھینٹیں چھڑکائی جائیں۔ فرقہ وارانہ تفریق کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قومیں اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی اپنی معاشرت اور تاریخ کے تاریک پہلو کو چھپائیں' اپنے ماضی کو بڑھا چڑھا کر دکھائیں اور ساتھ ساتھ نئی روشنی کے حملوں سے بچنے کے لیے جدید کو اپنے مشق ستم کا ہدف اور 'قدیم' کو تمام خوبیوں کا منبع ثابت کریں ـــ

چپکن اور گھٹنے کے ساتھ مسلمان متوسط طبقے نے طلسم ہوشربا اور اندرسبھا کا بانا بھی چھوڑا اور نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے پیرائے نکالے۔ انگریزی تعلیم کی مقبولیت نے ان کے آگے قدرت کے نئے مناظر پیش

کئے اور سماج کے ساتھہ 'ادب کو بھی پابندیوں سے آزاد کرنے کی کوشش ہونے لگی - نظام حکومت کی تبدیلی نے اس طبقے کو مجبور کر دیا کہ تحفظ حیات کے لیے اپنی ذہنیت کو مادی ضروریات کے لحاظ سے بدلے اور پھر تو اسے یکا یک معلوم ہونا بھی چاہئے تھا کہ مذہب کا وہ تصور غلط ہے جو اسے حرفتی تمدن کے ساتھہ چلنے سے روکتا ہے - زندہ رہنے کے لیے قبل از غدر کی رومانی اور داخلی (Subjective) فضا سےنکل کر واقعیاتی نقطۂ نگاہ پر آنا ضروری تھا اور اب ادب و زندگی میں بے ربطی اس طبقے کے لئے مضرت رساں تھی - قعر مذلت میں پڑے ہوے مسلمانوں کے جگانے کے لیے بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کرنا ضروری تھا - نظم کا عروج اور غزل کا زوال خود فریبی پر خود تنقیدی' تصور پر عقل اور پابندی پر آزادی کی فتح یابی کا ثبوت ہے - نئے جذبات اپنے لیے نئے اصناف تلاش کر لیتے ہیں - ادھر بنگال میں ٹیگور نے پیش پا افتادہ اور پامال بحروں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی طرز کی طرح ڈالی - اس کاوش میں اسے عہد وسطیٰ کے ویشنو شاعروں سے بڑی مدد ملی جو سماج کی پابندیوں کے ساتھہ سنسکرت چھندوں کی قید سے بھی آزاد تھے اور اپنی تیز رفتاری کے لیے نئی راہیں تلاش کرتے تھے - ہندی پر ان دوتحریکوں کا گہرا اثر ہوا اور برج بھاشا کو چھوڑ کر لوگوں نے کھڑی بولی کو اپنایا جو میرے خیال میں سنسکرت آمیز اردو ہے - اسی طرح گجراتی اور مرہٹی میں بھی شاعری نے نیا رنگ روپ اختیار کیا - غرض زندگی کے ساتھہ شاعری کا ظاہر بھی بدلا - اب یہ دیکھیے کہ زندگی کی مختلف النوع تبدیلوں کے ساتھہ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی کیسے بدل رہے ہیں —

'سرشار' اور 'مولوی نذیر احمد' کے ناول سامنتی تمدن کی پستی کے

دور کا نقشہ کھینچتے ہیں جو اب اتنی نمایاں تھی کہ چشم پوشی سے کام نہ چل سکتا تھا - یہ دونوں حضرات لکھنؤ اور دلی کی زندگی سے خوب آشنا تھے اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں شہر مسلمان حکمراں طبقے کے نقش آخر اور اب ان کے انتہائی تنزل کے آثار تھے - سجاد حسین کا اخبار ایک چھوٹے پیمانے پر وہی کر رہا تھا جو 'مولیر نے فرانس میں اور 'سروونٹس' نے اسپین میں صدھا سال پہلے کیا تھا - یہ دونوں سامنتی تمدن کے دور انحطاط میں پیدا ہوتے اور اپنے طنز کے تیروں سے اس کی زندگی دوبھر کر دیتے ہیں - سجاد حسین اور سرشار نے اپنی بساط کے مطابق یہی کیا -

ادھر ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق نے ان میں فرقہ پرستی کے بیج بو دیئے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ادب پر مردہ پرستی کی مہر لگ جائے اور دونوں قوموں کے اہل قلم ایک دوسرے پر چشمک زنی شروع کریں - ادب کی زندگی کا نیا دور انگریزی زبان کی رومانی تحریک سے متاثر تھا اور اس جذبۂ قومیت کے اظہار کے لیے رومانی ناول سب سے زیادہ مناسب تھے - چنانچہ بنگال میں 'بنکم چندر' اردو میں مولانا شرر اور مرہٹی میں آپٹے نے ناول نگاری کو نئے طریقے سے چمکایا - بنگال میں انگریزوں کے خلاف نسلی تعصب کے جذبات پھیل رہے تھے اور اس طرح بنکم چندر کے ناولوں میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے مظالم کی بھی داستان ہم پڑھتے ہیں - تعجب کا مقام ہے کہ اس زمانے کا یہ سرکاری عہدہ دار اور خطاب یافتہ مصنف دل میں وہ ولولۂ قومی رکھتا تھا کہ اس کا ایک ناول 'آنند متھ' بنگال میں نراج (Anarchism) کا محرک اور اس کا گیت بندے ماترم قومی تحریک کا ترانہ بن گیا - 'شرر' اسلامی فتوحات کا قصہ گو ہے لیکن بنکم چندر کی تحریروں سے پیچ و تاب

کھا کر 'منصور موھنا' جیسے ناولوں میں اپنے معاصر کی 'چنچل کماری'
کا جواب دیتا ھے - شکر ھے کہ ادب کے سر سے یہ آسیب جلد اتر گیا اور
بعد میں صرف اخباری نظموں اور 'افسانہ' کے نام سے منسوب کی جانے
والی چیزوں میں اس کا اثر باقی رہ گیا —

حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور
ان کے ہم عصر اردو اور هندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو
خیالات کی تبلیغ کے لیے بہت موزوں سمجھا - موجودہ دور کے هندی
شاعروں میں 'بابو میتھلی شرن گپتا' کا رتبہ بہت بلند ھے - مسدس سے
متاثر ھوکر انھوں نے 'بھارت بھارتی' نامی نظم لکھی جو هندی میں
بے حد مقبول ھوئی - موضوع دونوں کا ایک ھے، دونوں کا رنامۂ اسلاف سنا کر
زمانۂ حال کی زبوں حالی کی تصویر کھینچتے اور اپنی اپنی قوم کو
پیام عمل سناتے ھیں - مسدس جس کی نقالی هندی اور اردو دونوں
زبانوں میں کی گئی، ادبی انقلاب اور قومی بیداری کی خبر دیتی ھے -
اس کے چند سال بعد ھی انڈین نیشنل کانگرس وجود میں آتی ھے اور کچھ
عرصے بعد بنگال سودیشی تحریک شروع ھوتی ھے - یہ قومی اور سیاسی
تحریکیں بیداری کے آثار ھیں - ان کے محرک اور موید ایک تو وہ
لوگ تھے جو سیاسیات اور حکومت میں شرکت کے طالب تھے یا وہ لوگ
جو قومی حقوق یعنی دیسی صنعت و حرفت کی توسیع کا مطالبہ کررھے
تھے - هندوؤں میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً قومی خودداری کا احساس
بڑھتا جاتا تھا اور سیاسی بیداری کے ساتھ ادب میں بھی جوش و ولولہ
کے اثرات پیدا ھونے لگے تھے - گذشتہ صدی کے اواخر میں جب نیل کی
کاشت کے انگریز اجارہ داروں کے مظالم حد سے تجاوز کرچکے تو ایک

بنگالی مصنف کا ڈراما موسومہ 'نیل درپن' ہی تھا جس نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج کا علم بلند کر دیا اور بالآخر حکومت کو ان شکایتوں کو رفع کرنا پڑا - 'نوین چندر سین' نے پلاشیر جدہ (پلاسی کی لڑائی) کے عنوان سے ایک عدیم النظیر رزمیہ نظم لکھ کر بنگال کو اس خوں چکاں واقعے کی یاد دلائی اور مشہور ڈراماتسٹ ڈی - ایل - رائے نے کئی قومی گیت لکھے جو آج بھی بنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں —

نئی روشنی اور پرانی روشنی کا تنازع در اصل ہندوستانی سماج کی اس کش مکش کو ظاہر کرتا ہے جو مشینوں کے عروج اور دست کاری کے زوال کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی - ہمارے تعلقات کی نوعیت بدل رہی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نظریۂ زندگی بھی بدل جائے - یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی انسان میں ماضی کی پرستش کا جذبہ پیدا کردیتی ہے چاہے وہ بذات خود کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو - جس طرح بوڑھا عہد پیری میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہے درآں حالیکہ یہ یاد بے سود ہے' اسی طرح جب کوئی تہذیب غارت ہوتی ہے تو اس کے نام لیوا زمانۂ قدیم کی مدح سرائی کی صورت میں اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں - روس میں سامنتی دور کے انحطاط اور سرمایہ داری کی اُٹھان کے ساتھ 'طالسطائی' پیدا ہوتا ہے' انگلستان میں 'رسکن' اور 'کارلائیل' مشینوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں' فرانس میں 'روسو' رجعت قہقری کی حمایت کرتا ہے - اس دور کے ہندوستانی ادیبوں میں بھی بڑی حد تک یہ ذہنیت کام کررہی ہے - چونکہ ہندو اور اسلامی تمدنوں کا امتیاز متوسط طبقے میں رہتا آیا ہے اور یہی لوگ ہنوز قومی زندگی کے نگہبان اور علم و ادب کے پاسباں رہے ہیں' اس لیے اپنی اپنی

روایتوں کے لحاظ سے یہ اس جذبۂ شکست کا اظہار کرتے ہیں - ' طالسطائی '
جس قسم کے مزاج کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہندو تمدن کے عہد زریں کی
تصویر ہے - عدم تشدد ' رہبانیت ' مشینوں کا ناس اور اس قسم کی چیزیں
ہندو تمدن کے عناصر میں سے ہیں اور ان کے لئے قابل قبول ہیں - اسی
وجہ سے ' طالسطائی ' کے اصول ' ' ٹیگور ' کے ادب اور ' گاندھی جی ' کی
تحریکوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ہیں ' حالانکہ میرے خیال میں
' ٹیگور ' اس روسی ادیب سے قریب تر ہے - مسلمان ادبا بھی دور حرفت
اور مشینوں سے منحرف ہیں لیکن ان کی برائیوں کا حل وہ اسلامی روایتوں
کے مطابق تلاش کرتے ہیں - تاہم دور حرفت اور سائنس سے کلیتاً بغاوت
اور ماضی کی پرستش اس دور کے ادب کی بڑی خصوصیتیں ہیں -
' اکبر الہ آبادی ' ' اقبال ' اور ' ٹیگور ' جابجا مغربیت کے خلاف مشرقی
معاشرت کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں - خصوصاً ' اکبر '
کو ہر پرانی چیز اچھی اور ہر نئی چیز بری معلوم ہوتی ہے - لیکن
چونکہ وہ کوئی مفکر نہیں اس لیے اپنے باقی دونوں معاصروں کی طرح
موجودہ مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کرسکتا —

ادب ہند کے موجودہ رجحانات کو سمجھنے کے لیے سرسری طور پر یہ
دیکھہ لینا چاہئے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے ملک میں کیسی کیسی تحریکیں
بنتی اور بگڑتی رہی ہیں —

دیسی سرمایہ داروں کی تحریک بنگال کی سودیشی تحریک سے شروع
ہوکر سنہ ۲۲-۲۰ ع کے عدم تعاون میں اپنے حد عروج کو پہنچتی اور پھر رفتہ
رفتہ کم زور ہونے لگتی ہے اور گزشتہ تحریکوں کے بعد پر شکستہ ہو جاتی
ہے - قومی تحریکوں کی وسعت کے ساتھہ ہندو مسلم اتحاد کا صور پھونکا

جاتا ہے اور ہندی اور اردو کو ملانے کی کوشش ہونے لگتی ہے - عربی فارسی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال کم کرنے کی سعی بھی کی جاتی ہے اور ہندی میں اردو اور اردو میں ہندی الفاظ مقبول ہونے لگتے ہیں - مسلمان متوسط طبقے پر چونکہ حجاز و شیراز کا رنگ چڑھا رہا ہے لہذا ان کی تہذیب میں بھی غیر ملکی عنصر پایا جاتا ہے - یہ ایک عجیب بات ہے کہ وطن پرستی کے نقطۂ نظر سے اردو نے جو سب سے بڑا شاعر پیدا کیا وہ کوئی مسلمان نہیں بلکہ ایک ہندو یعنی 'برج نارائن چکبست' آنجہانی تھے - ہندو متوسط طبقہ ان تحریکوں میں پیش پیش رہا ہے اور اسی لیے اس کا ادب زیادہ قوم پرورانہ ہوتا جاتا ہے - ادھر قبل از جنگ اور دوران جنگ کی پان اسلامی تحریکیں اور سنہ ۲۱ - ۲۰ ع کی تحریک خلافت سے اردو شاعری بے حد متاثر ہوتی ہے اور 'اقبال' کی سرکردگی میں اسلامی قومیت کے سپاہی اردو ادب پر چڑھ آتے ہیں - با ایں ہمہ مسلمان نوجوانوں کا ایک طبقہ ملکی تحریکوں کا ہمدرد اور موئید ہے اور 'جوش ملیح آبادی' سیماب اکبر آبادی' اور 'ساغر نظامی' وغیرہ ان جذبات سے متاثر ہوے ہیں - عدم تعاون کی ناکامیابی کے بعد ملک میں کئی سال تک جمود کی سی کیفیت رہتی ہے - نوجوانوں کا ایک طبقہ مستقبل سے ہراساں ہوکر یا توانگریزوں پر بم پھینکنا چاہتا ہے یا طرب و نشاط میں اپنی کلفتوں کو بھول جانا چاہتا ہے - اس دور کی بعض ہنگامی تصنیفیں اور اردو اور ہندی شاعری کی رومانی تحریکیں اس جذبۂ شکست کو ظاہر کرتی ہیں - گاندھی جی کے عدم تشدد اور انقلاب پروروں کے نظریۂ تشدد میں تصادم ہو رہا ہے جس کا عکس ہم ایک طرف کھاڑی کے مشہور شاعر 'اناگولا' اور گجرات کے سحر طراز قومی

شاعر 'اردشیر خبردار' کی ستیاگرہی نظموں اور دوسری طرف شاعر انقلاب 'قاضی نذرالاسلام' کے ہنگامہ پرور کلام میں دیکھہ سکتے ہیں - سنہ ۲۵ ع کے بعد سے عوام کی خفتہ روح بھی جاگ رہی ہے اور مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی جد و جہد میں حصہ لینا شروع کردیا ہے - متوسط طبقے کے کچھہ لوگ ان کے حقوق اور مطالبات کی تائید کر رہے ہیں اور اسی طرح دور جدید کے ادب میں صرف یہی نہیں کہ ان کی حالت کیا ہے بلکہ کہیں کہیں یہ بھی دکھلانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے - 'پنڈت دیوندر ستھیارتھی' نے بہت بڑے پیمانے پر دیہاتی گیتوں کو جمع کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے - ادھر 'ٹیگور' 'شرت چندر چٹر جی' اور 'پریم چند' ان برائیوں کا حل 'اصلاح' کو سمجھتے ہیں اور سرمایہ داروں اور زمینداروں سے رحم و کرم کی توقع رکھتے ہیں تاکہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھہ ایک ہی گھاٹ پانی پی سکیں - کچھہ عرصے سے اشتراکیت اور انقلاب کی تحریکوں کی مقبولیت اور اصلاحی جد وجہد کی ناکامی نے ہر زبان میں ایسے ادیب پیدا کردیے ہیں جو نظام معاشی کی صحت کے لیے سرمایہ داری کی تباہی کو ضروری سمجھتے ہیں - اس ضمن میں ہم مرہٹی کی چندر لوک (چاند کی دنیا) اور بنگالہ کی 'شرمک گان' (مزدوروں کا گیت مصنفہ منصور احمد) کے نام لے سکتے ہیں —

بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ دور جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ہے اور غزل جیسی داخلی صنف کا زوال اور نظم جیسی واقعیاتی صنف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قایم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کرنا چاہتا ہے - اب دیکھنا یہ ہے کہ ادب کے یہ نئے رجحانات زندگی کو منزل

مقصود کی طرف لے جا رہے ہیں یا نہیں اور اگر ان میں کمی ہے تو وہ کس طرح دور ہو سکتی ہے - ہم اپنی سہولیت کے لیے اس دور کے کچھہ بڑے شاعروں اور ادیبوں پر زیادہ وضاحت سے نظر ڈالیں گے اس اعتبار سے کہ یہ لوگ کن مختلف ادبی تحریکوں کے پیشوا ہیں —

رجعت اور ٹیگور | حرفتی تہذیب پرانی بنیادوں کو تہ و بالا کر کے زندگی میں خلا پیدا کر دیتی ہے - خاندان کا شیرازہ منتشر ہوتا جاتا ہے' دیہاتوں کی خود اطمینانی ختم ہوتی اور شہروں کی ہنگامہ پروری ان پر حاوی ہوتی جاتی ہے - سرمایہ داری پرانے بندھنوں کو توڑ کر نئی راہوں کو بھی بند کر دیتی ہے - بچہ اگر بڑھ کر بالغ ہوگیا تو اس کی پوشش کے لیے نئے کپڑوں کی ضرورت ہے - پرانی تھگلیوں میں لپیٹا گیا تو یا تو اس کا دم گھٹ جائے گا یا کپڑا پھٹ جائے گا - لیکن سادہ لوح والدین اِس کش مکش سے گھبرا کر کپڑوں کی قید سے اسے آزاد کرنے کو ہی مصلحت وقت سمجھتے ہیں - یہی حالت ان منکرین کی ہے جو راہ ترقی کی دشواریوں سے بچنے کے لیے رجعت کی کلہاڑی سے دنیا کے پیر کاٹنا چاہتے ہیں —

طالسطائی پر تنقید کرتے ہوے ' لینن ' ایک جگہ لکھتا ہے کہ " اس کی قوت تخلیقی اور جدت طبع بظاہر سرمایہ داری کے مظالم پر نکتہ چینی کرتی ہے - حکومت کے استبداد اور عدالت کی انصاف کشی پر اس کا دل غم و غصہ سے لبریز ہے - تہذیب کی فتوحات کے ساتھہ جس طرح غریبوں کے خون سے دولت کے ایوان کھڑے ہوتے ہیں وہ ان سب کا جائیزہ لیتا ہے - لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ بانگ دہل ہے جو یہ مجذوب تشدد کے مقابلے میں عدم تشدد کی حمایت میں بلند کرتا ہے - طالسطائی میں مظالم کے خلاف نفرت ہے ' کسی روشن مستقبل کی تمنا ہے ' ماضی ' کی پابندیوں سے

آزاد ہونے کی جد و جہد ہے؛ لیکن ساتھ ساتھ اس کا تصور ابھی خام ہے؛ شعور سیاسی کی کمی ہے اور تغیر پسندی سے جھجک ہے" —

قبل از انقلاب - فرانس اور روس کے ادبا اور مفکرین نظام زندگی کی بد علوانیوں کی عقدہ کشائی کرتے رہے لیکن جب کسی نے آگے بڑھ کر اس کے عملی سد باب کی تدبیر بتائی تو یہ حواس باختہ ہو کر تصوف اور روحانیت کے حجروں میں جا چھپے - ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا ہے اور ٹیگور کو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرسکتے ہیں -

شاعر سوال کرتا ہے کہ "کوی کی گائیے' کی شنائیے؟ - شاعر تو کیا گائے گا کیا سنائے گا؟ اور خود ہی جواب دیتا ہے: "دنیا میں جب سب لوگ بر سر کار تھے' اکیلا تو آوارہ لڑکوں کی طرح بھاگ کر میدان میں آیا اور بھری دوپہر میں غم دیدہ درختوں کے سایے میں بیٹھ کر دن بھر بانسری بجاتا رہا - للہ اب تو اٹھ جا -

آگ کہاں لگی ہے؟ دنیا کو بیدار کرنے کے لیے کون صور پھونک رہا ہے - کسی کی فریاد سے فضا گونج رہی ہے؟ کس قید خانے میں پا بہ زنجیر دکھیاری مدد کی طلب‌گار ہے؟

لا تعداد بے بسو کے سینوں کا خون توہین انسانی کو غسل دے رہا ہے - خود غرضی درد انسانی پر ہنس رہی ہے - وہ بے زبان جو سرنگوں کھڑا ہے - جس کے اترے ہوئے چہرے پر صدیوں کے مظالم کی داستاں کندہ ہے' جو جیتے جی ہر قسم کے بار کو اٹھائے چلتا ہے اور پشت در پشت اس بار مصائب کو ورثے میں چھوڑ جاتا ہے — وہ قسمت کا گلہ گزار نہیں ہے' نہ دیوتاؤں کو کوستا ہے اور نہ انسان کی شکایت کرتا ہے - جو کام کرنے کے لیے زندہ رہتا ہے اور زندہ رہنے کے لیے دو مٹھی اناج کے سوا کچھ نہیں

چاھتا اور جب اس مایۂ حیات کو بھی کوئی چھین لیتا ھے' جب کوئی فرعون اس کے اس اثاثہ پر بھی دست درازی کرتا ھے تو وہ بد بخت غریبوں کے خدا کو پکار کر جان دے دیتا ھے —

اسی حسرت نصیب کو قوت گویائی بخشتا ھے - اس کے ٹوتے ھوئے دل میں امید کا دیا جلاتا ھے - اسے پکار کر کہتا ھے کہ چشم زدن کے لیے سر بلند ھوجا - اور پھر دیکھ کہ جس ظالم کے خوف سے تو لرزہ بر اندام ھے وہ تجھ سے کہیں زیادہ بزدل ھے - جیسے ھی تو جاگے گا وہ راہ فرار اختیار کرے گا - تیرے سامنے آتے ھی وہ راستے کے کتے کی طرح دم ھلانے لگے گا - خدا اس کا دشمن ھے' وہ بے یار و مددگار ھے' اس کی چرب زبانی پر نہ جا - وہ دل ھی دل میں اپنی ذات پر نادم ھے —

اے شاعر' اگر تیرے دل میں ذرا بھی احساس ھے تو اسے اپنا ھمنوا بنا اور اپنی زندگی اس پر قربان کر - غم و اندوہ کی انتہا نہیں اور اس سیاہ خانے کی تاریکی اور الم نصیبی کا کوئی ٹھکانا نہیں ھے - روٹی' زندگی اور روشنی کی ضرورت ھے - صحت' غم اور آزادی سے دنیا کو مالا مال کرتا ھے - اے شاعر' افلاس کی طغیانی میں ایک مرتبہ جنت کے ھوشربا نظاروں کے دروازے کھول دے -" (ماخوذ از چترا)

سرمایہ دارانہ تمدن کے خلاف اپنی مشہور نظم 'وسوندھر' (زمین) میں کہتا ھے :—

"یہ حیاسوز خون کی پیاسی بربریت کسی دین و آئین کی قائل نہیں اور نہ کسی رسم و رواج کی پابند ھے - اسے فکر فردا ھے اور نہ فکر امروز - اس کی زندگی سمت و ساحل سے بے خبر ھو کر دیوانہ وار بھاگ رھی ھے - نہ وہ ماضی کی طرف دیکھتی

ہے اور نہ مستقبل کی پروا کرتی ہے - ' آج ' کی موجوں پر آوارگی اور حباب آسا مسرتوں کو نچاتی ہوئی وہ اس بے حقیقت ناؤ کی طرح رواں ہے جو اپنا ہر بادباں کھولے کسی راہ بے منزل کی طرف جا رہی ہو ' —

لیکن بجائے اس کے کہ وہ ان تعلقات کی بربادی کا آرزو مند ہو جو انسان کے لیے آتش زیر پا بن گئے ہیں وہ پیداوار کے تمام جدید ذرائع کو مٹا کر دور وحشت کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے - تہذیب سے خطاب ' نامی نظم میں کہتا ہے : " اے نئی تہذیب ' مجھے وہ پرانے دشت و جبل لوٹا دے اور اپنے اس شہر کو — اس لوہے ' پتھر اور لکڑی کے مقبرے کو واپس لے لے - اے انسانیت سوز تہذیب لئیم ' ایک بار پھر وہ عبادت گاہ مجھے لوٹا دے جس کا سایۂ عاطفت نیکی کا گہوارہ تھا ... میں آزادی چاہتا ہوں ' اپنے بازوؤں کو پوری طرح پھیلانا چاہتا ہوں - اپنے سینے میں پھر ان کھوئے ہوئے جذبات کو جگہہ دینا چاہتا ہوں اور تمام پابندیوں کو توڑ کر اپنے دل کو اس دنیا کا آئینہ بنانا چاہتا ہوں " —

ٹیگور کا کوئی ادبی کارنامہ حال اور ماضی کے اس تنازع سے خالی نہیں ہے - زمانۂ حال سے اسے سخت نفرت ہے ' سرمایہ دارانہ تمدن کا وہ گلہ گزار ہے - یہ تمدن مادی مطالبات سے روح کو گراں بار ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے وجود سے انسان کو بے پروا بنا رہا ہے - زندگی ابد تک وسیع کیا ہوتی بلکہ ' آج ' اور ' ابھی ' کی ایک ساعت میں سمٹ رہی ہے - ' ٹیگور ' یہ خوب سمجھتا ہے کہ نظام معاشی کی افراتفری نے ہی یہ ستم برپا کیا ہے - روس کی سیاحت کے اثنا میں وہ پروفیسر پیٹروف کو لکھہ چکا ہے کہ روس کی اس ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں دولت پر کسی ایک

طبقے کا نہیں بلکہ پورے سماج کا قبضہ ہے - تاہم اپنے ملک کے مسائل کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آتا سوا اس کے کہ لوگ جنگلوں اور پہاڑوں میں تصوف کی الجھنوں کو سلجھاتے رہیں - امید و بیم کے دو متضاد جذبات اس کے کلام میں جا بجا ملیں گے - انسانیت کے مستقبل پر اس کا ایمان ہے لیکن تغیر کب اور کیسے ہوگا یہ وہ نہیں بتا سکتا - یہ رنگ عمر کے ساتھ زیادہ نمایاں ہوتا جاتا ہے اور 'سونار تری' (سنہری کشتی) میں جس نامعلوم منزل کا پتا دریافت کیا گیا تھا شاعر اپنے آخری مجموعہ 'بلاکا' میں بھی اسی کی تلاش میں سرگرداں ہے: "جو دریاے زندگی میں اتر چکا وہ ساحل کی پروا کیوں کرے؟ کشتی کا آسرا کیوں ڈھونڈے؟ ناخدا کا احسان کیوں اٹھاے؟ اس کارواں کی کوئی منزل مقصود نہیں' نہ وہ کہیں ٹھیرتا ہے' اور نہ کہیں آرام لیتا ہے - راہ میں کہیں دم بھر آرام لیے بغیر وہ اس راستے پر چلتا رہتا ہے جس کا اور چھور نہیں ملتا "—

اس کی اکثر نظمیں اس فقدان مقصد کو ظاہر کرتی ہیں مثلاً:
"انسان کی وہ آوازیں میرے کان میں گونج رہی ہیں جو کہر آلود ماضی سے نکل کر بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم رستے سے سفر کرتی جا رہی ہیں - اور اپنے دل میں اس آشیاں بدر پرندے کی فریاد سنتا ہوں جو لاتعداد پرندوں کے ساتھ اس دھوپ چھانو سے نکل کر معلوم نہیں کہاں سے کہاں جا رہا ہے - اس کا یہ نغمہ فضا کو مترنم کردیتا ہے کہ یہاں نہیں 'کہیں اور' کہیں اور' کسی دوسری جگہ —"

راہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شاعر کی جستجو ناکام رہ جاتی ہے اور وہ تصوف کے الجھیڑے میں الجھ کر انجام کار حزنیت کا شکار ہو جاتا

ہے - چنانچہ اس کی پچھلی نظموں میں سے اکثر موت 'عدم' فنا اور پیری کا نوحہ سناتی ہیں - وہ ٹیگور جس نے بنگال کی سودیشی تحریک سے متاثر ہوکر لکھا تھا کہ "اگر تیری پکار سن کر کوئی نہیں آتا تو نہ سہی تو اکیلا ہی بڑھا چل" — جس کے ولولہ انگیز نغمے نے انقلاب پروروں کو دار و رسن پر امید کا چراغ دکھلایا تھا — "اگر رات اندھیری ہے اور کوئی راستہ نہیں دکھاتا تو اپنے سینے کی ہڈیوں کو مشعل راہ بنا اور اکیلے ہی چلا چل" — اس کا جسم ہی نہیں روح بھی بوڑی ہوچکی اور اس کا پچھلا مجموعۂ کلام اس کی بے راہ روی کا افسانہ ہے —

کاھے گاھے ٹیگور رفارمر کی صورت میں بھی نظر آتا ہے - "گورا" اور "کمدنی" نامی ناولوں میں سماج کی ناپاکیوں کو دکھانے کے بعد وہ تعلیم یافتہ طبقے سے انصاف اور اصلاح کی اپیل کرنے لگتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نظام میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر برائیاں دور ہوسکتی ہیں -

غریبوں میں وہ نمک حلالی اور ایمان داری کے جذبات پیدا کرنا چاھتا ہے اور امیروں کو رحم دلی اور انصاف پروری کی تلقین کرتا ہے - اپنی ایک نظم "بوڑھا نوکر" میں اس ملازم کا تذکرہ رو رو کر کرتا ہے جو لاکھہ تکلیفیں جھیل کر بھی اُف نہیں کرتا اور مالک کو خدا مانتا ہوا اس کی چوکھٹ پر مرجاتا ہے -

بہر نوع جہاں تک استعمار کا سوال ہے 'ٹیگور' اس کا مخالف ہے - بعد از آں اس کے پیغام میں ثنویت (Dualism) پیدا ہو جاتی ہے- سرمایہ دارانہ تمدن کو وہ سرمایہ دارانہ نظام کا نہیں بلکہ مشینوں کے رواج کا لازمی نتیجہ سمجھہ کر اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ آگے چلوں یا پیچھے بھاگوں - اور جب ملوکیت کو فنا کرنے کے لیے اس سے عملی تدبیریں دریافت کی

جاتی ہیں تو وہ اصلاح، عدم تشدد اور تصوف کی تبلیغ کرنے لگتا ہے - تاہم ٹیگور کے کلام کا بڑا حصہ ادب جدید کے لیے قابل قبول ہے اور یہ خیال بڑی حد تک غلط ہے کہ وہ عمل کا دشمن ہے - ٹیگور ہر کام پر پیام عمل سناتا ہے اور اس لحاظ سے اپنے معاصرین سے کہیں بلند اور قابل احترام ہے کہ اس کا پیغام کسی خاص دور یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں ہے - اس کا نقطۂ نظر بین الاقوامی اور زمان و مکان سے بالا تر ہے —

اکبر الہ آبادی مرحوم رجعت اور قدامت کے سب سے بڑے علم بردار گزرے ہیں اور ان کا طنز از آغاز تا انتہا مغرب پرستی کے ماتم سے بھرا پڑا ہے - یہ ان بوڑھے والدین کے شاعر ہیں جن کا تمدن دیسی جوتی، پگڑی اور اچکن تک محدود ہے اور جن کا مذہب چھکڑوں پر چل سکتا ہے، ریل گاڑی سے اسے بعد ہے ! یہ سامنتی تمدن کا شدید احتجاج تھا جو طنزیہ تک بندی میں کفر کے فتوے صادر کر رہا تھا - یہ کہنا لا حاصل ہے کہ یہ ادبی رجحان عام تھا جو نئی روشنی اور پرانی روشی کے اس تنازع کا پرتو ہے جو اب بھی ہر ہندوستانی خصوصاً ہر مسلمان خاندان میں شدومد کے ساتھ جاری ہے - سامنتی تمدن مغربیت کے نرغے سے نکلنے کے لیے نئی نئی ترکیبیں سوچتا ہے - کبھی وہ انگریزی تعلیم کا یک لخت مخالف ہو جاتا ہے اور کبھی ملازمتوں کی لالچ سے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ مغرب سے اچھی اچھی چیزیں لے لی جائیں - چنانچہ ہمارے ادبا کا ایک گروہ اب اس حد تک صلح کرنے پر تیار ہے کہ مشرق و مغرب یعنی سامنتی اور حرفتی تہذیبوں میں میل کرا دیا جائے - اس لچر نظریہ کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ ہنوز ہمارے ملک میں سامنتیت کے کھنڈر باقی ہیں اور صنعت و حرفت کو وہ فروغ نصیب نہیں ہوا جو ملوکیت سے آزاد ہوکر ہی حاصل

ہو سکتا ہے - بہر حال ' ٹیگور ' اقبال ؛ جوش اور اردشیر خبردار جیسے استعمار دشمن شاعروں نے بھی ' مشین ' اور ' مشین کے مالک ' کے امتیاز کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور تقسیم کی بے عنوانی سے تنگ آکر پیداوار کے ذرایع کو مٹا دینا چاہتے ہیں - جو غلطی سیاسی میدان میں گاندھی جی اور دوسرے سامنتی رہنما کر رہے ہیں ' اس کا اعادہ دنیائے ادب کے یہ اکابر بھی کر رہے ہیں - ظاہر ہے کہ ان جذبات کی مقبولیت مادی اعتبار سے دنیا کو پیچھے لے جائیگی کیونکہ تہذیب کے مستقبل کا انحصار قدرت اور انسان کی جنگ کے نتیجے پر ہے - اس لیے یہ نظریہ انسان کی شکست اور پسپائی کا اعلان ہے —

فاسیزم (fascism) اور اقبال —

اقبال کا نظریۂ زندگی بڑی حد تک اس تحریک سے متاثر ہے جس کے بانی ' جمال الدین افغانی ' تھے - مشرق نے مغربی استعمار کی چیرہ دستیوں کے خلاف جو احتجاج شروع کیا اور یورپ میں نیٹشا ' برگساں اور میزنی نے حرفتی تہذیب پر جو اعتراضات کیے اقبال ان سے بھی اثر پزیر ہوا - وہ اسلام کے نام پر ایک تصور عالم پیش کر رہا ہے اور اس کی رائے میں مسائل زندگی کا واحد حل یہ ہے کہ دنیا اس تصور کو عملی جامہ پہنائے - یہاں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اقبال فاسطیت کا ترجمان ہے اور یہ درحقیقت زمانۂ حال کی جدید سرمایہ داری (neo-capitalism) کے سوا کچھہ نہیں ہے - ظاہر ہے کہ فاسیزم پر کوئی جامع بحث اس مضمون کے احاطے سے باہر ہے لیکن اگر ضرورت ہوئی تو اپنے تجزیہ کی تائید میں بعد از آں ثبوت پیش کروں گا —

سلطنت (State) بجائے خود کوئی مقصد نہیں بلکہ سماج کے تعلقات انسانی کی محافظت کا ایک آلہ ہے اور چونکہ ان تعلقات کا انحصار ذرائع پیداوار کی ملکیت

پر ہے اور وہی طبقہ سماج میں برسر اقتدار ہوتا ہے جس کے ہاتھہ میں کلید ملکیت ہے لہذا سلطنت ' تہی دست طبقے کی پامالی کے لئے ' طبقۂ غالب ' کی انجمن کارساز ہے - ارتقائے انسانی کے لئے ضروری ہے کہ زمام سلطنت اس طبقے کے ہاتھہ میں رہے جو پیداوار کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے سکے - سرمایہ دارانہ نظام نے یہ فایدہ ضرور پہنچایا کہ سامنتی سماج کی بنیاد کو فنا کر کے مشینوں کے رواج کو عام کر دیا - لیکن اس کی عمر طبیعی اسی روز ختم ہوگئی جب وہ پیداوار اور اس کی تقسیم میں ارتباط قائم نہ کر سکا - کیونکہ دور حرفت اجتماعی پیداوار کا زمانہ ہے اس لئے ضروری ہوگیا کہ پیداوار کے ذرایع پر چند لوگوں کی ملکیت نہ ہو بلکہ پورا سماج اس کا مالک اور منتظم ہو - یہ تبھی ممکن ہے جب وہ محنت کش طبقہ سلطنت کی باگ ڈور اپنے ہاتھہ میں لے جو اقتصادی قالب کو اس طریقے سے بدل سکتا ہے - سرمایہ داری انحطاط پزیر ہوتی جاتی ہے اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے وہ نئے حیلے تراشتی اور نئے معاونین تلاش کرتی ہے -

مشین نے معاشیات کو قوم و ملک کی حدود سے نکال کر بین الاقوامی بنا دیا ہے اور اب اس کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ قومی حکومت کی پابندیاں توڑدی جائیں اور مالیات و سیاسیات میں امتزاج پیدا ہو جائے - لیکن وطنی سرمایہ داروں کی جماعتیں یوں خود کشی نہیں کر سکتیں - بین اقوامیت کے چڑھتے ہوے دریا کو روکنے کے لئے وہ نئی دیواریں باندھنے لگتے ہیں - وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہمارا ملک یا ہماری قوم یا ہمارا مذہب یا ہماری نسل دنیا میں سب سے زیادہ افضل اور اکمل ہے - اطالیہ قدرت کی طرف سے دنیا کے نام ایک خاص پیغام لایا ہے ! جاپانی برگزیدہ بندے ہیں ' جرمن خدا کی بہترین مخلوق ہیں ! وہ اپنا فرض اسی حالت

میں ادا کرسکتے ہیں کہ آپس کی خانہ جنگیاں بند ہوں - رعایا کا ہر فرد عام اس سے کہ وہ سرمایہ دار ہے یا مزدور صرف ایک حاکم کا اطاعت گزار ہے - ہیگل اور اس کے جرمن متاخرین سلطنت کو اس تصور (Idea) کی تعبیر بتاتے ہیں جس کے حصول کے لیے سماج ارتقا بالضد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے- پارلیمینٹری نظام حکومت صرف اس حالت میں قابل قبول تھا جب تک مالیات میں عدم مداخلت (laissefaire) کے اصول پر عمل ہوسکتا تھا - لیکن اب مزدوروں کی تحریک کو کچلنے اور ساتھ ساتھ سلطنت میں یک جہتی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جمہوریت کو فنا کرکے ڈکٹیٹری قائم کی جائے - ڈکٹیٹر ایک انسان برتر ہے جو ہر طبقے کے ساتھ انصاف کرتا ہے جو ہر قسم کے طبقاتی اور نسلی تعصب سے بالا ہے - وہ سرمایہ داری کی سرکوبی کرتا ہے اور مزدوروں کو ' انتہا پسندی ' کی طرف نہیں جانے دیتا ! پھر اس کا وطن دنیا کا پیشوا ہوگا ' اس لئے وہ قومی اور وطنی تہذیب کا نگہبان بھی ہے ! اشتراکیت میں وطنیت ' قومیت اور روحانیت کے لئے جگہہ نہیں ہے اور چونکہ متوسط طبقے کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے ' اس لیے وہ ہمیشہ ان کی دوہائی دیا کرتا ہے - اس طبقے کے نوجوان پرزا سیست حکومت کے پشت پناہ ہیں —

اقبال ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ اس قوم کے ایک خاص طبقے کو مخاطب کرتا ہے - یہ طبقہ نوجوانوں کا ہے - تاریخ اسلام کا ماضی اسے بہت روشن اور شاندار معلوم ہوتا ہے - اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا دور فتوحات اسلام کے عروج کی دلیل ہے اور ان کا زوال یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں - حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اسلام کی ابتدائی فتوحات عرب ملوکیت کی فتوحات نہیں تھیں -

اور تاریخ کے کسی دور میں کبھی اسلامی تصور زندگی پر عمل بھی ہوا تھا - بعد از آں ' مسلمانوں نے جو کچھہ کیا وہ قطعاً غیر اسلامی تھا - اور ممکن ھے کہ وہ روحانی اعتبار سے مسلمان ہوں لیکن اسلام کے سماجی تصور سے انہیں کچھہ زیادہ واسطہ نہ تھا - بہر حال ' وطنیت کا مخالف ہوتے ہوے بھی 'اقبال' قومیت کا اس طرح قائل ھے جس طرح 'مسولینی' - اگر فرق ھے تو صرف اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ھے اور دوسرے کے نزدیک مذہبی - فاسسٹوں کی طرح وہ بھی جمہور کو حقیر سمجھتا ھے :

متاعِ معنئی بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
زِموراں شوخیِ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوریت از پیام مشرق)

فاسیزم اور اشتراکیت میں ایک فرق یہ بھی ھے ' کہ جہاں اول الذکر عوام کو پیدایشی خر بتاتا ھے' وہاں اشتراکیت ان کی کم فہمی کو ماحولی سمجھتی ھے اور بنا بریں اس ماحول کو بدلنے کی ضرورت اور بھی بڑہ جاتی ھے-
فاسیزم کا ہمنوا ہوکر وہ اشتراکیت اور ملوکیت دونوں کی مخالفت کرتا ھے-

ہر دو را جانِ ناصبور و ناشکیب ہر دو یزداں ناشناس ' آدم فریب
زندگی این را خروج' آں را خراج درمیانِ این دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ہر دو را تن روشن و تاریک دل

(اشتراکیت و ملوکیت از جاوید نامہ)

ملوکیت و سرمایہ داری کا وہ اس حد تک دشمن ھے جس حد تک متوسط طبقے کا ایک آدمی ہوسکتا ھے - بندہ اور بندہ نواز کی تفریق

بظاہر مٹ جائے اور محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیں!

مشینوں کا رواج انسانیت کے لیے مضرت رساں ہے:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

در آں حالیکہ آلات خود کچھہ نہیں کرتے، بلکہ وہ مخصوص حالات مروت کو کچل دیتے ہیں جن میں ان سے کام لیا جاتا ہے - آلات تو مال پیدا کر دیتے ہیں، اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس کی تقسیم مناسب طریقے سے کرے - 'اقبال' مزدوروں کی حکومت کو چنداں پسند نہیں کرتا ــــ

زمامِ کار اگر مزدوروں کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

ہوس اندر دل آدم نہ میرد هماں آتش میانِ مرزغن هست
عروس اقتدار سحر فن را هماں پیچاک زلف پرشکن هست
نماند ناز شیریں بے خریدار اگر خسرو نباشد کوهکن هست

(از پیام مشرق)

سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجودہ بنیادوں کو مٹاکر نظام معاشی کو از سر نو قائم کرنے کے لیے 'اقبال' ایک تصور عالم پیش کرتا ہے - لیکن ایک بین اقوامی تصور کا عامل اس کے نزدیک ایک بین اقوامی طبقہ نہیں بلکہ ایک قوم ہے جس میں ایک بہت بڑا گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو 'اقبال' کی نظر میں بھی مسلم نما کافر ہیں اور اس کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف یہی لوگ ہوں گے - اپنے خواب کی تعبیر اطالوی فاسیست میں دیکھہ کر وہ جوش سے کہتا ہے:

رومتہ الکبرا! دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں ھیں تیرے سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت ! یہ تمنا ! یہ نمود !
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حباب
نغمہ ھاے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے ؟ کرامت کس کی ہے ؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

(مسولینی از بالِ جبرئیل)

یہ فیض 'مسولینی' کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لیے ساری دنیا کو فنا کرسکتا ھے' جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ھے' جو جنگ کو انسانیت کے لیے شہرِ مادر بتاتا ھے - 'اقبال' ایسے ڈکٹیٹر کو ھی اسلامی پاکستان کے استحکام کا ضامن سمجھتا ہے - خلافت کا تصور اس کے نظرے کی تائید کرتا ہے حالانکہ 'خرانِ جمہور' میں وہ 'طبع سلمانی' کہاں جو اس ڈکٹیٹر کو 'مشورہ' دے سکے —

مختصر یہ کہ 'اقبال' اسلامی فاسیت ہے اور اس کا ردعمل بھائی پرمانند اور ڈاکٹر منجے کے ھندو فاسزم کی صورت میں ظہور پزیر ھو رھا ہے جن کے نزدیک ویدک عہد کی تہذیب انسانیت کی معراج' اور ذات پات کی تقسیم' تقسیم عمل کا بہترین نمونہ ہے !

ادب اور قومیت ھندو مسلم نفاق در اصل دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش ہے اور ھم دیکھ چکے کہ کس طرح 'ٹیگور' اور 'اقبال' اپنا تصور عالم پیش کرکے ان متضاد رجحانوں کو ظاھر

کر رہے ہیں - سیاسی اغراض کی خاطر ہر دو قوم کے متوسط طبقوں میں باہم اتحاد اور امتزاج کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ بھی ادب ہند پر ایک نقش چھوڑ گئی ہے اور دونوں قوموں کے کئی ادیب خالص وطنی اور قومی جذبات سے متاثر نظر آتے ہیں - وہ ہندوستانیوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ خانہ جنگیوں کو بند کرکے غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنا محاذ قائم کریں - ان کے نزدیک وطن سب کچھ ہے - وہ یہ بھی نہیں سوچنا چاہتے کہ آئندہ حکومت کا دستور کیا ہوگا - بس انگریزوں کے جاتے ہی کوئی جادو کی چھڑی ہر معاملے کو درست کردے گی گویا سماج کی تمام برائیاں صرف ان سے وابستہ ہیں - ظاہر ہے کہ اب تک جو سیاسی تحریکیں اس ملک میں اُٹھ اُٹھ کر گرتی رہیں وہ اس قوم پرورانہ جذبے سے متاثر تھیں جس کے پیچھے دیسی سرمایہ دارانہ مفاد کام کر رہے تھے - اردو میں 'چکبست' 'جوش' اور 'ساغر نظامی' ہندی میں 'نوین' ایک 'بھارتیہ آتما' اور 'بابو میتھلی شرن گپتا' انگریزی میں 'سروجنی نائیڈو' اور 'ہرین چٹر جی' گجراتی میں 'ارد شیر خبردار' اور دکن میں 'اناگولا' اس قومی رجحان کے ترجمان ہیں - ہندو مسلم تفریق کو مٹا کر ایک قوم کو جنم دینے اور ہندی اور اردو کی آمیزش سے ایک زبان وضع کرنے کا بھی سامان ہو رہا ہے - چنانچہ صرف نثر میں ہی نہیں بلکہ نظم میں بھی اردو والے ہندی کے اور ہندی والے اردو کے بکثرت الفاظ مستعمل کرنے لگے ہیں- تحریک اتحاد کے بعد ہی اردو میں ہندی گیتوں کی مقبولیت ہوئی اور ہندی میں مشہور شاعر 'ہری اودھ' کی ٹھیٹ ہندی کو قبول عام میسر آیا - ان کے چوپدے پڑھیے تو بہ اعتبار زبان وہی لطف آتا ہے جو 'آرزو لکھنوی' کی خالص اردو میں —

قومی تحریک کا سب سے بڑا شاعر شاید ''اردشیر خبردار' ھے - گجرات میں آج اس کا وھی مرتبہ ھے جو اردو میں اقبال کا اور بنگالہ میں 'ٹیگور' کا - وہ کوئی ھنگامی شاعر نہیں بلکہ قومیت کے نظریے کی تہہ تک پہنچتا ھے اور اس کا مجموعۂ کلام 'درشنکا' (فلسفہ) بمبئی یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ھے - اس کا ترانہ 'گلونتی گجرات' اقبال کے ترانے یا ڈی - ایل - رائے کے 'بنگ آمار لچھمی بھومی' سے کم مقبول نہیں ھے - وہ سخت قسم کا وطن پرست اور قوم پرور ھے - اپنی ایک نظم میں کہتا ھے —

"اے مادر وطن! روز آفرینش سے جس کے خوابوں کا ھار تیرے تاروں سے گوندھا گیا ھے —

جو مرتے دم تک تیرے ھی نام کو بوسے دیتا ھے -

اے ماں، اُس نے تجھے پہچان کر اپنی خودی کو سمجھا ھے -

جب میں مرجاؤں تو تیری خاک پاک سے دوبارہ جنم لوں تاکہ تجھہ پر دوبارہ قربان ھوسکوں - تیری مٹی میرے لیے مایۂ حیات ھے، کیونکہ خالق کے پرستار کی مٹھی میں تمام مخلوق ھے" —

ایک دوسری نظم میں ستیاگرہ کی تبلیغ یوں کرتا ھے: "آج اپنے ساتھہ کیا کیا لوگے؟ جرأت تلوار میں نہیں دل میں رھتی ھے - کاش تمہاری ھمت مردانہ میں ھے ورنہ ھر تلوار بے آب ھے - ان کند ھتھیاروں کو پھینک کر دل کو جنگ کے لیے مستعد بناؤ - ھمیں کسی کا خون نہیں بہانا ھے - حریف کے خون جگر سے ھم اپنے دل کے دیوتا کو کیوں کر ناپاک کریں - جس فتح کی تاریخ انسان کے خون سے لکھی جاتی ھے وہ بے پایاں ھے —"

ادب اور تحریک اصلاح

مغربیت نے اتنا فائدہ ضرور پہنچایا کہ ھمارے ارباب حل و عقد اپنی آنکھوں کے شہتیر کو دیکھنے

لگے - یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ان کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی حد تک بے ربط ضرور ہے - چنانچہ ہندوؤں میں سماج سدھار' کی تحریک زور شور سے چل پڑی - سوشل معاملات میں کم عمری کی شادی' بیواؤں کی بدحالی اور مردوں کی تماش بینی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں - گجرات میں گووندرام نے اور بنگال میں 'ٹیگور' اور 'شرت چند' نے اس تحریک کی حمایت میں افسانے لکھے - ادھر مسلمانوں کی ہر برائی بھی چونکہ برگزیدہ ہے اس لیے 'قاضی سرفراز حسین' اور 'راشدالخیری' نے چند پیش پاافتادہ مسائل پر اکتفا کیا اور ایک عرصے تک کسی کو جرات نہ ہوئی کہ ایک تیز نشتر لے کر اس ناسور کو دکھاے جس نے سماج کے رگ و پے میں زہر ساری کر دیا ہے - اس طرف دو کتابیں ایسی شائع ہوئیں جو قابل توجہ ہیں اور مسلمان تعلیم یافتہ جماعت میں ایک نئے رجحان کا پتا دیتی ہیں - انگارے ' افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جو اب ضبط ہو چکا - یہ افسانے ہماری جنسی زندگی کا مرقع تھے اور حالانکہ ان کا انداز تحریر جنسی تشدد سے متاثر تھا اور اس ذہنیت کا آئینہ دار تھا جو روح یا پیٹ کی طرح محض جنس ہی کو واحد شعبۂ زندگی قرار دیتی ہے ' تاہم اردو افسانہ نگاری میں یہ پہلی مثال ہے کہ ادب نے منافقانہ پابندیوں پر اپنے فرائض کو ترجیح دی ہو - دوسری کتاب 'لیلیٰ کے خطوط ' ہے - افسوس کہ اس کے مصنف نے مظلوم نسوانیت کا ترجمان ایک شاہد بازاری کو بنا کر اس مسئلہ کو محدود بنا دیا اور شہری زندگی میں طوایف کی ناگزیریت کو نظر انداز کر دیا ورنہ اس کتاب کا شمار ہندوستان میں دور جدید کی اچھی تصنیفوں میں ہوتا - تاہم اس کی مقبولیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس طبقے کے کچھ لوگ محض

اصلاح کو هی کافی نہیں سمجھتے اور یہ بھی دیکھنے لگے هیں کہ ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلی کرنی ضروری ہے -

اقتصادی مسایل میں طبقاتی تصادم (Class-war) کا مطلع صاف هوتا جاتا ہے اور واقعیت نگار ادیب اس طرف بھی متوجہ هونے لگے هیں - 'پریم چندر' کے تقریباً سبھی کردار اصلاح پسند (Reformist) هیں - اس کے سامنے ایسے خوش حال زمین داروں کی مثالیں هیں جو 'طالسطائی' کے 'قسیئری' (Resurrection) کی طرح کسانوں میں اپنی جائداد تقسیم کر کے اپنی زندگی کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دیتے هیں - عورتیں اپنے قربوں سے نکل کر مردوں کے دوش بدوش قومی زندگی کی تدوین میں حصہ لے رهی هیں - 'سجان سنگھ' 'پریم شنکر' اور 'ونیے کمار' اسی قسم کے نوجوان هیں - 'سمن' 'گایتری' اور 'صوفیہ' ایسی هی عورتیں هیں - لیکن جب ایسے زمین دار مستثنیات میں شمار هوتے هیں اور اس کلیہ کو ثابت کرتے هیں کہ اپنے حقوق سے کوئی طبقہ برضا و رغبت دست بردار نہیں هوتا تو پریم چندر سوچ میں پڑ جاتا ہے اور راہ انقلاب کی آتش اندوزیوں سے اس کی آنکھیں خیرہ هو جاتی هیں - طالسطائی اور ٹیگور کے نقش قدم پر چلتے هوے وہ انقلاب اور رجعت کے دوراهے پر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کہتا هوا بیٹھ جاتا ہے کہ اے کاش اس رستے پر چلے بغیر هم وهاں پہنچ جاتے ! -

اصلاح کی هر تحریک نیک نیتی لیکن تنگ نظری پر مبنی ہے - زندگی اور موت میں اتحاد نہیں هو سکتا اور نہ ظالم و مظلوم کو ایک لڑهی میں گوندها جا سکتا ہے - اسی طرح تعلقات جنسی میں اس وقت تک توازن 'استحکام و صحت کی گنجائش نہیں جب تک زندگی کے دوسرے

مسائل سے ہم اسے الگ کر کے دیکھنے کی عادت نہ چھوڑ دیں اور ترغیبات جنسی کو شیطان کا غلبہ نہیں بلکہ ایک فطری جبلت (instinct) نہ سمجھنے لگیں —

ادب اور فقدان مقصد

پل صراط کی طرح انقلاب کا رستہ بھی بڑا دشوار گزار ہے - بہت سے لوگ راہ میں تھک تھک کر رہ جاتے اور تصوف کی خندق یا نراج کی گھاتی میں گر پڑتے ہیں - ہندوستان ایک دورِ تغیر سے گزر رہا ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک گروہ لازمی طور پر داخلی کش مکش میں مبتلا ہے - اس کے لیے زندگی کی حقیقت ایک رقص شرر سے زیادہ نہیں ہے - اس کی زندگی کا کوئی معیار یا مسلک نہیں ہے - ماضی اس کے لیے بے معنی اور مستقبل لا یعنی ہے - جو کچھہ ہے ''ابھی' اور 'آج' کی مسرتوں میں ہے - شراب و شباب کا یہ فلسفہ پہلے بھی اس ملک میں مقبول تھا لیکن ہر جام کے ساتھہ توبہ تھی اور ہر معصیت کے ساتھہ احساسِ گناہ اور عفو گناہ کی امید - لیکن اب مستقبل کی تاریکی خودکشی کے رجحان کو بڑھاتی جاتی ہے اور باہمت بے راہ رَو بم پھینک کر 'کم ہمت لوگ آپ اپنی جان لے کر اور آزاد منش 'خیام' 'بائرن' اور 'آسکر وائلڈ' کی قسمیں کھا کر اس نراجی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں - دنیائے ادب میں اس کا پرتَو رومانیت اور 'ادب برائے ادب' کی صورت میں آشکار ہوتا ہے - حقائق کی تلخ کامیوں سے گھبرا کر انگلستان میں 'بائیرن' اور 'کیٹس' وغیرہ نے سامنتیت کے زوال کے زمانے میں اور اب ییٹس (Yeats) اور ڈی - ایچ لارنس وغیرہ نے حرفت کے زوال کے وقت اسی جذبۂ شکست کا اظہار کیا ہے - ہمارے ملک میں بھی متوسط طبقہ میدانِ کارزار سے گھبرا کر تصوف اور رومانیت کی آڑ پکڑنے لگتا ہے - ہندوستان

کا سب سے بڑا ناول نگار ' شرت چندر چٹرجی اپنے ناول چرتر ہین ' بدا خلاق) شیش پرشن (آخری سوال) اور 'شری کانت ' میں ایسے ہی لوگوں کی تصویر کھینچتا ہے - بنگلہ اور ہندی میں رومانیت اور ٹیگور سے اثر انداز ہو کر شاعری میں ' چھایہ واد ' یعنی اثاریت (Symlolism کی تحریک شروع ہوئی اور حقیقت پرستوں کو ایک عرصے تک ان رجحانات کے خلاف بر سر پیکار رہنا پڑا - اردو کے نوجوان شاعروں میں بھی یہ ذہنیت عام ہو گئی ہے اور یہ اصحاب حسن و عشق کے علاوہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز نظر آتے ہیں' حالانکہ نہ ان کا عشق بوالہوسی سے علحدہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کا معیار حسن عالم دوشیزگی سے آگے بڑھتا ہے - ان کی حب نسوانیت دوشیزہ پرستی تک محدود ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جس طرح ہمارے نظام زندگی میں عورت اپنی مالی ضروریات کے لئے مرد کی دست نگر ہے اسی طرح مرد اپنی شہوانی ترغیبات کے لیے اس کا غلام بن گیا ہے -

زندگی میں حسن و عشق کے لئے بڑی جگہہ ہے اور شراب و شباب کے لیے بھی - لیکن ان کے نام پر زندگی کے مطالبات سے بے پروا ہونے کی کوششیں رجعت پرورانہ اور لائق تعزیر ہیں —

نذرالاسلام

پورے ہندوستانی ادب میں صرف ایک ایسا شاعر ہے جو میکسم گورکی کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے - جو انقلاب پرور ' قدامت شکن اور تغیر پسند ہے - جب ادب کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ انسان کو رلائے یا سلائے اور یا گمراہ کرے تو اُفق بنگال پر ایک ستارے کا طلوع ہوتا ہے جو صراط مستقیم کا نشان ہے - مختصراً نذرالاسلام کا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ زندگی دایم و قایم ہے اور انسان لاشریک لہ اس کا مالک ہے - انسان اور قدرت کی کش مکش کا نام تہذیب ہے اور انسانیت کی ترقی

کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کس حد تک قدرت پر فتح حاصل کر لی ہے - انسان سب سے افضل اور اکمل ہے - دین حق کا مطلب ہے ہر قسم کے ظلم کا سدباب اور اخوت و مساوات کا قیام - قومیت، سرمایہ داری، تمیز رنگ و نسل اور تفریق مذاہب کو وہ انسانیت کے لیے سم قاتل سمجھتا ہے - اس کے خیال میں ایک نسل کو دوسری نسل کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - ہر آنے والی نسل زندگی کی محافظ اور ضامن ہے —

اس لحاظ سے 'نذرالاسلام' کو روحانیت نوازی اور داخلیت سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں - جب دنیا حیات و ممات کی کش مکش میں ہے تو وہ ایسے وقت میں فلسفۂ قدرت پر غور و خوض کو غیر ضروری اور مضر مانتا ہے - اس وقت فلسفۂ قدور (Philosophy of Values) کی فکر کہیں زیادہ اہم اور مفید ہے - جب رجعت اور انقلاب بر سر پیکار ہوں تو ادب فصیل پر بیٹھ کر واقعیت (Realism) کے کیمرے سے فوٹو نہیں لے سکتا - یا تو وہ رجعت کے قلعے میں جا چھپے گا یا انقلاب کے میدان میں ہوگا اور یا تصوف و داخلیت کے خندق میں جا گرے گا - طبیعتاً وہ باغی اور سرکش ہے - حسن و عشق کی وادیوں میں گرفتار ہو کر بھی اپنی منزل کو نہیں بھولتا "پجارن" میں عشق کی ناکامیوں کا رد عمل یوں بیان کرتا ہے : "معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا - کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سفر بن جاؤں - راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں؟ کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اس مرتبہ اپنے غارتگر دہانے کھول دیں؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے ترانے میرے ہم سخن بن جائیں - لے آؤ اپنے آتشیں رتھ اور پھونک دو

ہنگام قیامت کے صور! برساؤ زہر و آتش میں بجھے ہوے تیر! برباد کردو
اِس دنیاے معصیت کو!. ٹپکاؤ یہ خونیں شراب عزرائیل کے گلے میں!"

نذرالاسلام کے نزدیک دنیا ہمیشہ دو طبقوں میں بٹی رہی ہے - اور
اس ظالم و مظلوم کی تفریق کو اقبال چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی کی
ستیزہ کاری بتاتا ہے - لیکن جہاں ایک "خود گزاری" و "نالۂ نیم شبی"
اور 'گنبد نیلوفری' کے تماشوں کا آسرا ڈھونڈتا ہے' دوسرا مظلوموں کو
اتحاد و انقلاب کا درس دیتا ہے :

" میں اس روز مطمئن ہونگا جب مظلوموں کی فریاد فضاے
آسمانی میں نہ گونجے گی - اور جب میدان جنگ میں تلوار
اور خنجر کے خوف ناک ترانے نہ سنائی دیں گے - وہ جو ازلی
باغی اور میدان جنگ سے نالاں ہے' صرف اسی روز خاموش ہوگا -" (باغی)

" وہ جو سمندر کی گہرائی میں' آسمان کی وسعت میں' زندگی کے
ہیجان میں 'فضا' کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما رہتا ہے —
وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے کہ جو بجلی کو
اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا
اور اسی کے گیت گاتا ہوں -"

(پیام شباب)

اپنے عزم راسخ کے لیے وہ کسی معاوضے کی تمنا نہیں کرتا - وہ حال
کی ترجمانی کر رہا ہے تاکہ انسانیت کا مستقبل روشن ہو زمانہ اُسے یاد
کرے گا یا نہیں اسے اس کی پروا نہیں ہے :

" میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں' مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں —

کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ شاعر کو قید و بند سے کیا نسبت! کسی کا مشورہ ہے کہ تو دوبارہ جیل جا کہ وہیں خوب لکھہ سکتا ہے - مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پاکر مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے- ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے - گاندھی جی مجھہ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں - عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست بتاتے ہیں- غرض کہ میری جان ضیق میں ہے —

لوگو ' سنو کہ یہ دل انتقام اور درد کی آگ سے پھنکا جارہا ہے - تن تنہا خون نہیں بہا سکتا ' اس لیے اپنے خون سے یہ نظمیں لکھہ رہا ہوں -

مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں -

تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں میری خونچکاں تحریر ان کے لیے پیام موت ثابت ہو!" سرمایہ اور محنت کے تصادم کے انجام پر سماج کی قسمت کا انحصار ہے - وہ طبقۂ محنت کش ہی ہے جو تقسیم کی بے انصافیوں کو دور کرکے پیداوار کے ذرایع کو انتہاے عروج پر لے جا سکتا ہے - شاعر اس کی فتحیابی کا ترانہ یوں گاتا ہے :

" وہ مبارک ساعت آپہنچی -

ہتھوڑی اور کدالی لیے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھہ دیتا ہے '

راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں '

تمہاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے '

تمہارا بارِ گناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے '

وہی — صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے - میں اسی کے گیت گاتا ہوں -

اس کا ٹوٹتا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا -

اونچی عمارتوں میں رہ کر اب یہ توقع نہ کرو کہ یہ خاک نشیں ہمیشہ تمھارے آگے سر بسجود رہے گا ــ

جو لوگ فرط احترام سے مادر گیتی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں وہ انہیں ہی اپنا وارث بنائےگی -

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن سے لپٹ کر مٹی اپنی یگانگی کے اعلان کرتی ہے -

آج بےکسوں اور مظلوموں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے - اب تمام پابندیوں اور بندھنوں کو توڑ کر پھینک دو -

فلک کج رفتار کو چاہیے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے -

ہمارے سروں پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے پھول بن کر برسیں کہ ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے ــ

مزدوروں کی جمعیت کو مژدہ ہو کہ ہم سب ایک ہی کارواں کے مسافر ہیں - ایک کا دکھہ سب کے لیے موجب اندوہ ہے اور ایک کی توہین بنی نوع انسان کی توہین ہے ــ

آج دنیا کے کل بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دور بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھہ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان خوف سے لرزتا ہے ! "

نذرالاسلام شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے - وہ تغیر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے - وہ قدیم کا حریف اور جدید کا علم بردار ہے - وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں چھاونی کی کسبی نہیں بلکہ جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے - اس کی شاعری ادب ہند کے رستے میں ایک نئی للکار ہے جو بتاتی ہے کہ آرٹ موت کا نہیں زندگی کا پروردہ اور خادم ہے - وہ اس روح کو مٹا

دے گا جو جسم کو قید سمجھتی ہے - وہ استعمار و استبداد کو فنا کرکے حسن و عشق کے صحیح جذبات سے انسان کو آشنا کرے گا ـ

ادب جدید کی ضرورت

اس مختصر سے سماجی تجزیے میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی تھی کہ ادب ہند کا دور قدیم حقائق زندگی سے نا آشنا اور بالکل داخلی تھا - کوئی حل پیش کرنا تو درکنار وہ زندگی کے مسایل کو سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے - دور جدید زندگی سے اس حد تک بیگانہ نہیں ہے اور اس کی خدمت کا ولولہ بھی رکھتا ہے - لیکن اس کے بتلائے ہوئے راستے بڑی حد تک گمراہ کن ہیں -

ادب کا فرض اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم ' وطن ' رنگ و نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو - انسانیت کے دشمنوں کی دشمنی دراصل درد انسانی کی دلیل ہے - اب تک ہمارا ادب زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بیچارگی کا نوحہ پڑھتا آیا ہے - اب اسے اس جذبۂ بزدلی سے نکل کر یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ابدالاباد تک ہے اور انسان اس کا کارساز حقیقی ہے - قیامت کے معنے یہ ہیں کہ روح الاجتماع داور محشر بن کر استبداد کو ہمیشہ کے لیے جہنم رسید کرے اور پھر اسی زمین پر ایک ایسے بہشت کی تخلیق کرے جس میں ہر انسان ذہنی جسمانی اور روحانی ترقی کی بلندیوں تک پہانچ سکے - انسانیت اور ادب کے مسلک الگ نہیں ہیں اور دونوں کی نجات کا رستہ بھی ایک ہے - وہ یہ ہے کہ ستم رسیدہ انسانیت اپنے حقوق اور ان کے غاصبوں کو سمجھے اور ان تمام پابندیوں کو توڑ دے جو اس کے ارتقا کی راہ میں حایل ہوں - یہ مضمون اردو کے ادیبوں کے لیے لکھا گیا ہے ' لہذا میرا

خطاب ان سے ہے —

ایک طرف پولیس کا وہ پنشن خوار داروغہ ہے جو تا عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے - اسے ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اسے رلانے اور سلانے میں مدد پہنچائیں - پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردے میں سب سے بڑا دنیا دار ہے اور جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے ایک گونہ تسکین ہوتی ہے - اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مرید شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سن کر کسی مجنوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں - وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئن وہ خود ہوں اور جن کے ہیرو خود کشی کر کے بٹیروں کی طرح تڑپ رہے ہوں -

آپ اب تک انہیں لوگوں کے لیے لکھتے رہے ہیں - کیا آپ کی آئندہ ادبی کاوشیں بھی انہیں کے لیے وقف ہوں گی؟ —

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے - زمین دار اور سود خوار جونک کی طرح اس کا خون پی رہے ہیں - مولوی اس پر خود گزاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں - اس کی بیوی روٹیوں کے لیے عشوہ فروشی پر مجبور ہے - اس کے بچے بھوک سے تنگ آکر آپ کی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں - اور وہ مزدور ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے - وہ مال اس لیے پیدا کرتا ہے کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اسے ہتیا لے جس کے لیے لغت میں 'مالک' کا لفظ تراشا گیا ہے - قید خانے کی کوٹھریوں سے بد تر جھونپڑیوں میں' پلیگ اور ہیضے میں تڑپ کر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس حسرت میں مر جاتا ہے کہ مارواڑی کا سانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا! —

کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا کبھی ان اسباب وعِلل کو مٹانے کا خیال آپ کے ذہن میں آیا ہے؟ - اگر نہیں تو آپ ادب کے لیے باعث ننگ ہیں - ایسے ادیبوں کے لیے کروپاٹکن کہتا ہے: "کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمھارا دل خون نہیں ہوجاتا تو اپنے قلم کو پھینک دو - اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمھارے بیحس دل کی ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے؟"

گویا ادب آج کبیرداس کی زبان میں کہہ رہا ہے:

'کبیرا' کھڑا بزار میں لیے لکاٹھی ہاتھ جو گھر پھونکے آپنا چلے ہمارے ساتھ -

ہمیں ان لوگوں سے غرض نہیں جن کے دماغ روپیوں کے لیے چکلا گھر بنے ہوئے ہیں اور جو سرمایہ دار پبلشروں اور جاہل و بے درد شہریوں کے زر خرید غلام ہیں - ہمارا خطاب ان سے ہے جو تخلیق ادب کو رتبۂ پیغمبری دیتے ہیں - جو حق گو اور حق پوست ہیں اور جو سچ کہتے ہوے کسی قسم کی پابندی سے نہیں ڈرتے -

اردو اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں - اردو اگر قومی زبان بننا چاہتی ہے تو اسے ہر قسم کے خیالات وجذبات کا حامل بننا چاہیے - وہ زبان ہرگز کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان بننے کا استحقاق نہیں رکھتی جس کے حسن و قبح کا فیصلہ کوئی مذہبی جماعت کرتی ہو - یعنی اردو کے ادیبوں کو رواداری اور روشن خیالی کی تلقین کرنا چاہیے -

متوسط طبقے کی زندگی بند پانی کی موری ہے - عوام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے اور انھیں بتایئے کہ وہ اس خستہ حالی میں کیوں ہیں اور

کس طرح نجات حاصل کر سکتے ہیں —

اردو ادب کی زن پرستی دونوں جنسوں کے لیے باعث عار ہے - پردے کی سختی اور عورت کی کم یابی نے مرد کے نقطۂ نگاہ کو یکسر Masochistic (خود اذیتی) بنادیا ہے - سجاد حسین اور مہدی حسن جیسے آزاد خیال ادیب بھی عورت کو شہوت رانی کا آلہ سمجھتے ہیں - جنسی مساوات کی تبلیغ ہی اس ناپاک ذہنیت کو دور کرسکتی ہے —

مولویوں اور پنڈتوں کی زبان میں گفتگو بند کیجیے - عربی و سنسکرت کو ان کے لیے اور انہیں عربی و سنسکرت کے لیے چھوڑ دیجیے - ادب کو فطری بنانے کے لیے ہندوستانی اسپرٹ ہی نہیں ہندوستانی صورت اور اسلوب بھی اختیار کیجیے —

ادب جدید کے حامیوں کی انجمن بنائیے اور اس کے آرگن شایع کیجیے تاکہ جدید خیالات کی اشاعت میں آسانی ہو اور قدامت پرستوں کے اعتراضات کا جواب دیا جاسکے —

ہر سیاسی اور سماجی انقلاب کے پہلے ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی عوام ہر اعتبار سے ملکی جد و جہد سے الگ اور نا آشنا ہیں تو اس کی ذمہ واری ان کے تعلیم یافتہ طبقے پر ہے جو خود بھی اوہام و تعصب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے - اب وہ وقت آگیا ہے کہ اردو کے ادیب بھی اپنے بنگالی اور ہندی معاصرین کے نقش قدم پر چلیں اور یہ ثابت کر دکھائیں کہ ادیب کا مشرب قومی و مذہبی تعصبات سے پاک ہے اور وہ واقعتاً انسانیت کا خادم، مصور اور پیشوا ہے —

سوچیئے کہ انسانیت کے ماضی میں آپ کے لیے کون سے اشارات پنہاں ہیں، مسایل حال کیا ہیں اور مستقبل کی راہ کیا ہے - اپنے انداز بیان

کو ایسی جلا دیجیے کہ وہ ظلم کے لیے تلوار اور مظلوموں کے لیے بیداری کا صور بن جائے —

اور آپ کا مذہب کیا ہو؟ ٹیگور سے بھی کسی نے یہ سوال کیا تھا اور اس کا جواب دنیائے ادب کا جواب ہے! - "میرا مذہب وہ ہے جو ہر آرٹسٹ کا مذہب ہونا چاہیے - میں کسی ایک قوم یا مذہب یا ملک کا ترجمان نہیں ہوں - میری زندگی بنی نوع انسان اور جملہ اقوام کے لیے اور میرا پیغام ان کے ارتقا کے لیے ہے - میری روح زندگی اور انسانیت کی وحدت میں گم ہوگئی ہے اور میں مذہبی، قومی و طبقاتی پابندیوں کو توڑ چکا ہوں" —

اور آپ کا فرض کیا ہے؟ جو ہر انسان کا فرض ہونا چاہیے - کروپاٹکن کے آگے بھی یہی سوال آیا تھا اور اس کا جواب ہر ایمان دار ادیب کا جواب ہے : "اگر تمہیں اپنے دل و دماغ میں جوانی کی امنگوں کا احساس ہوتا ہے، اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو، اگر تم پاک و صاف، مکمل اور ارتقا پرور زندگی سے سرفراز ہونا چاہتے ہو — یعنی اگر تم ان حقیقی مسرتوں سے محظوظ ہونا چاہتے ہو جن کی تمنا ہر ذی حیات کرتا ہے — تو مضبوط بنو، عظمت و وقار کے زینوں پر چڑھو اور ہر کام مستقل مزاجی سے انجام دو —

اپنے چاروں طرف زندگی کی تخم ریزی کرو - خبردار! اگر تم دھوکا دوگے، جھوٹ بولوگے، اور سازش کروگے تو آپ اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاؤگے، قعرِ پستی میں جاگروگے اور تمہاری حالت اس غلام کی سی ہو جائے گی جو اپنے آقا کو اپنا خدا ماننے لگتا ہے! اگر تمہارا رجحانِ طبع اسی طرف ہو تو یہی کرو لیکن اس حالت میں لوگ تمہیں کم زور، حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگیں گے اور تم سے ایسا ہی برتاؤ کریں گے - تمہاری طاقت کا کوئی ثبوت نہ پا کر عوام تمہیں قابل رحم سمجھیں گے — سوچو

T.D. Khalique

رحم و کرم کے قابل ہو جانا انتہائی ذلت ہے - اگر خود اپنی صلاحیت کے بال و پر نوچتے ہو تو دنیا کو دشنام نہ دو - اس کے خلاف خود کو کمر بستہ کرو اور اگر کہیں تمہیں کوئی بے انصافی نظر آتی ہو خواہ اس کی نوعیت کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو — تو تم اس جبر و ظلم اور ناحق کے خلاف بغاوت کر دو - جہاد کرو تاکہ ساری دنیا اطمینان کی زندگی بسر کر سکے - یقین جانو کہ اس لڑائی میں تمہیں جو روحانی مسرت حاصل ہوگی وہ اور کہیں نہیں مل سکتی — "